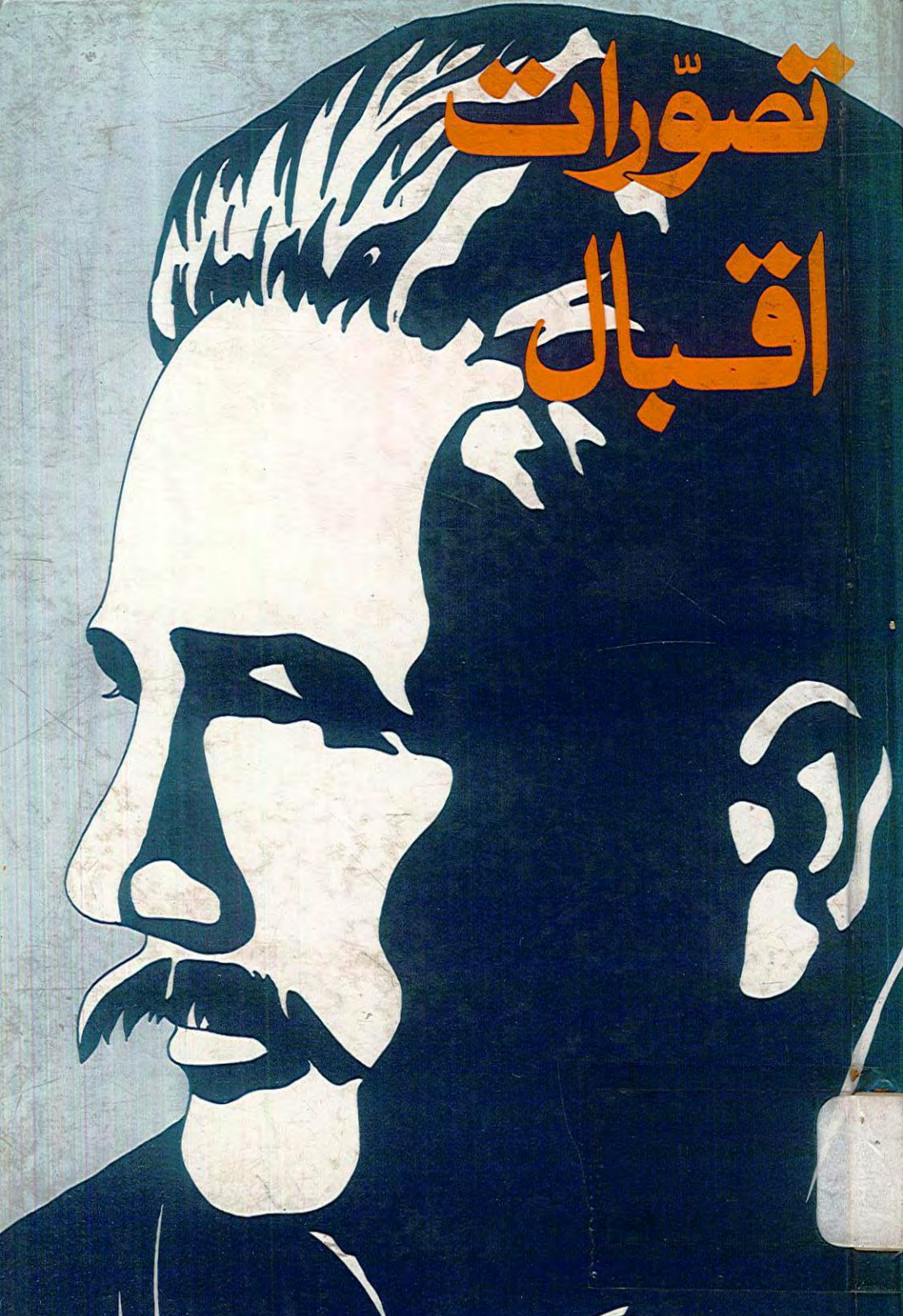
تصوّراتِ اقبال



سیّد اسعد گیلانی

تصوّرات اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیّد اسعد گیلانی

تصوّرات اقبال

سیّد اسعد گیلانی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

(اقبال)

GIFT

جملہ حقوق محفوظ ہیں

© فیروز سنز لاہور

بار اوّل ---------- ۱۹۹۱ء

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY,
ACC NO..... 18,536
LAHORE.

مطبع ___ فیروز سنز لاہور

مجلّد ___ 969 0 01015 8

فہرست

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
☆ حرفِ اول ۔ مرتب	۷	تصوّر اتحادِ اسلامی	۱۲۵
☆ تعارفِ اقبال ۔ فقیر وحید الدین	۹	تصوّر ملت اسلامیہ	۱۲۹
تصوّر مذہب	۳۱	تصوّر مردِ کامل	۱۳۲
تصوّر توحید	۳۷	تصوّر مردِ مومن	۱۳۷
تصوّر رسالت	۴۴	تصوّر حریت فکر و عمل	۱۴۲
تصوّر قرآن	۴۷	تصوّر وجود زن	۱۴۷
تصوّر شریعت	۵۲	تصوّر محبت	۱۵۳
تصوّر خلافت	۵۵	تصوّر نسائیّت	۱۵۴
تصوّر امامت	۶۲	تصوّر مخلوط تعلیم	۱۵۵
تصوّر ملکت	۶۳	تصوّر عشق	۱۵۸
تصوّر نظریاتی مملکت	۶۷	تصوّر عصائے کلیمی	۱۶۱
تصوّر تجدید ملت	۷۷	تصوّر اشتراکیت	۱۶۴
تصوّر تجدید و احیائے دین	۸۶	تصوّر غم	۱۷۰
تصوّر اجتہاد	۱۰۳	تصوّر وطنیت	۱۷۲
تصوّر انقلابِ اسلامی	۱۱۱	تصوّر آرزو	۱۷۳
تصوّر انقلاب و آزادی	۱۱۹	تصوّر رہبانیت	۱۷۵

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
تصوّرِ عشق و فقر	۱۷۸	تصوّرِ فاشرم	۲۰۵
تصوّرِ مغربی تہذیب	۱۸۰	تصوّرِ رجائیت	۲۱۵
تصوّرِ نشاۃ ثانیہ	۱۸۴	تصوّرِ انسانِ کامل	۲۲۰
تصوّرِ خودی	۱۸۷	تصوّرِ شاہین	۲۲۳
تصوّرِ معیشت	۱۹۷	اقبال کا تصوّرِ سفرِ مدینہ منورہ	۲۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

"تصوّرات اقبال"، ملّی، نظری اور فکری مسائل کے بارے میں علّامہ اقبالؒ کے خصوصی نظریات پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ہم علّامہ کے بارے میں سینکڑوں کتابوں میں بکھرے ہوئے عمومی خیالات و افکار کے انبار میں سے ان کے حقیقی اور بنیادی افکار و نظریات سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ جو حقیقت میں علّامہ کی فکری نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے قاری کو علّامہ اقبال کی مجموعی فکر کی طرف براہ راست رہنمائی کرتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ علّامہ اقبالؒ کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآن و سنّت ہیں۔ ان کے قلبی جذبات کی گہرائی رسولِ اکرمؐ کے عشق سے وابستہ ہے۔ ان کا پُرجوش والہانہ پن اسلام کے صدرِ اوّل سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ان کے ہیرو اسلام کے مشاہیر اور عالمی سطح پر فلاحِ انسانیت کے علمبردار ہیں۔ مشرق و مغرب کے ازموں اور فلسفوں سے وہ بیزار ہیں۔ ان میں ملی غیرت و حمیت کا چشمہ ہمیشہ موجزن رہتا ہے وہ اپنے افکار کے چمنستان میں ایک ایسے درویش خدامست دکھائی دیتے ہیں جو فقر کے درمیان فقر اور کجکلاہوں کے مقابلے میں خودی اور خودداری کے عظیم نگہبان ہیں۔ علّامہ اقبال کا قاری انہیں ان کے افکار کے آئینے میں انسانیت کے بہی خواہ، ملّت اسلامیہ کے رہبر خوان، اسلام کے سپاہی حضورؐ اکرم کے فدائی اور خدا کے ایک خوددار بندے کی حیثیت سے شناخت کرتا ہے اور یہی صفات وہ اپنے قاری میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

یہی اوصاف ان کے تصوّرات کا خلاصہ ہیں انہیں تصوّراتِ اقبالؒ کو زیادہ

سے زیادہ عام فہم، راست فکری کے ساتھ میں نے اس مجموعۂ مضامین میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح ہم ایک ہی نظر میں جملہ مسائلِ زندگی اور افکارِ ملی و اسلامی کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے نقطہ نظر سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ہم نے علامہ اقبال کے صرف ان شارحین کی تشریحات کو اس کتاب میں جگہ دی ہے جو عمومی طور پر علامہ کی فکر سے ہم آہنگ ہیں۔ ایسے شارحین جو علامہ اقبال کی فکر کو اس کی سمتِ سفر سے ہٹا کر اپنی مزعومہ سمت میں لے جانے کی کوشش کرتے ہیں ہم نے ان شارحین سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ وہ علامہ اقبالؒ کے افکار کے نہیں بلکہ صرف اپنے ذاتی رجحانات و تصوّرات کے نمائندے شمار ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان کے بارے میں اصحاب الشمال یعنی بائیں بازو والوں کی تشریحات غیر معتبر ہیں اور ان کا علامہ اقبالؒ کے فکری ذخیرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں نے نوجوانوں اور طلباء و طالبات کی فکری رہنمائی کے لیے، "تصورات اقبال" کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل حقیقی تصوّراتِ اقبالؒ سے آگاہ ہو سکے۔

۱۰- اپریل ۱۹۹۰
سیّد اسعد گیلانی

اسلامی اکادمی
منصورہ - لاہور

تعارفِ اقبال

اقبال آپ اپنا تعارف ہیں۔ جس شخص کے بارے میں ڈیڑھ ہزار سے زائد تصانیف مختلف زبانوں میں موجود ہوں اس کے علمی تعارف کی ضرورت تو نہیں رہ جاتی۔ البتہ انسان کی فکری ذات زیادہ سے زیادہ تعارف و تعلق کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

بہر حال آپ یہ فراموش نہ کریں۔ کہ اُن دنوں[1] زندگی فراغت سے اتنی عاری اور کشاکش ایام سے ایسی بھرپور نہ تھی جیسی کہ اب ہے۔ احباب یک جا ہوتے تو گھنٹوں محفل جمی رہتی۔ صبح بیٹھے تو شام تک ہر مسئلہ اور گراں موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ بیچ میں کوئی شگفتہ مضمون آن پڑتا۔ تو بھاٹی دروازہ میں ہمارے آبائی مکان کا دیوان خانہ بلند اور مسلسل قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

مجھے گھر آئے دو دن گزرے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ملازم نے آکر ابّا جان بلا رہے ہیں"

والد صاحب کے قریب ایک صاحب صوفے پر دراز تھے۔

والدِ بزرگوار نے کہا۔ "یہ میرا دوسرا لڑکا ہے"۔

صوفہ نشین صاحب نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور مجھے شفقت سے اپنے پاس فرش پر بٹھالیا۔ یہ علامہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس زمانہ میں اقبال مرحوم خوش رو اور خوش زیب نوجوان تھے۔ عام طور پر بڑھیا انگریزی لباس پہنتے۔ لیکن ہمارے ہاں آتے اور طویل صحبت کا سامان ہوتا۔ تو سوٹ

---

[1] فقیر وحید الدین کی کتاب روزگارِ اقبال سے استفادہ کیا گیا۔

اتار کے دھوتی پہن لیا کرتے۔ اور واپسی پہ دوبارہ سوٹ پہن لیتے۔ لباس سے مستقل بے اعتنائی انہوں نے چند سال بعد اختیار کی۔ جب وہ میکلوڈ روڈ والے مکان میں اُٹھ آئے تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دھوتی اور بنیان کے علاوہ کسی اور ملبوس میں کم دیکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کالج کے متعلق مختلف سوالات پوچھنا شروع کئے۔ جن کا میں اناپ شناپ جواب دیتا رہا۔ اس لیے کہ خود میرے دل میں بہت سے سوالات پوچھنے کے لیے گدگدی ہو رہی تھی۔ ان دنوں لوگ انگلستان کے سفر کو عجب رشک اور استعجاب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوانوں کو تو دن رات انگلستان ہی کے خواب آیا کرتے میری بھی بہت دنوں سے یہی کیفیت تھی علامہ کے فکر و کلام کی عظمت کا تو کس کافر کو اندازہ تھا کوئی تجسّس تھا تو یہی کہ ان سے انگلستان کے قصّے سنیں۔ پے در پے جانے کتنے سوال کر ڈالے وہ ہر ایک کا مسکرا کر جواب دیتے رہے۔ ضبط نہ ہو سکا تو میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ "انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں آپ کو بھی چاہیئے تھا کہ اپنا نام A-K-BALL رکھ لیتے" ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔ "بھئی ہم نے تو نہیں کیا۔ لیکن تم ولایت جاؤ گے تو اس نسخہ پر عمل کرنا۔ اور اپنا نام WA-HEED رکھ لینا!" میں اس جواب سے کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کسی بہانہ سے کھسک آیا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں نے علامہ کو اکثر اپنے ہاں رونق افروز ہوتے دیکھا اگر والد لاہور میں موجود ہوں تو شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا کہ اقبالؒ ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں یا والد ان کے ہاں نہ جاتے ہوں۔ اس لیے کہ ان بزرگوں کی دوستی، محبّت اور رفاقت کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں من و تو کے بیشتر حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ جذباتی اُلجھنیں ہوں یا گھریلو مسائل، ماضی کا کوئی دکھ ہو یا مستقبل کا کوئی اندیشہ، ہنگامۂ شادی ہو یا سانحۂ غم گزرا ہوا تجربہ ہو یا آنے والی مشکل، ہر بات میں باہمی اشتراک اور مشورت کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو دوست آپس میں ملتے تو ان کی طویل صحبتیں کچھ بہتے ہوئے پانی کا سا عالم یا دولاتیں۔ کبھی سست خرام اور پُرسکوت۔ کبھی پُرشور اور طوفانی

خامشی کے لمبے وقفوں کے بعد کبھی نہایت متین اور سنجیدہ گفتگو کی ہلکی ہلکی لہریں جنبش میں آتیں تو کبھی بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کا ایسا غلغلہ بلند ہوتا کہ سارا گھر گونج اٹھتا۔ ان صحبتوں کی کیفیت آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ گفتگو کے دوران جب کبھی باری تعالیٰ یا رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا۔ تو علامہ پر یکایک ایک وجدان سا طاری ہو جاتا اس موقع پر عام طور سے وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو جاتے۔

علامہ سے ہمارے خاندانی مراسم کی ابتداء اصل میں میرے درویش سیرت نانا فقیر سیّد افتخار الدین کے وسیلہ سے ہوئی۔ علامہ اقبال اوائل عمر میں ہی انہیں ملے۔ لیکن اس وقت بھی شاعر مشرق کے حال میں ان کا مستقبل درخشاں تھا۔ جس سے نانا ابّا بہت متاثر ہوئے اسی توسط سے ان کی والدِ محترم سے رسم و راہ شروع ہوئی۔ جو بعد میں اپنے مسائل معراج پر پہنچی اور خانۂ واحد کی سی بات ہو گئی۔

دیگر امور کی طرح میری تعلیم کے بارے میں بھی والد محترم ان سے رجوع فرمایا کرتے چنانچہ جب اسکول سے فارغ ہو کے میں نے انگلستان جانے کی رٹ لگائی۔ تو حسبِ معمول ڈاکٹر صاحب سے مشورہ طلب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تعلیم مکمل کرنے سے پہلے انگلستان کی خاک چھاننا بے سود ہے۔ ان کی رائے کا احترام اس قدر تھا کہ میرا شدید اصرار خاک بھی کام نہ آیا۔

والد محترم ڈاکٹر صاحب کی صحبت کو مکتب و مدرسہ سے کہیں بہتر تعلیم گردانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ رخصت پر آئے تو مجھے ہدایت فرما گئے۔ کہ "تمہارا پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ تو مت پڑھو لیکن یہ وعدہ کرو کہ ہر روز ڈاکٹر اقبال کے گھر صبح سے شام تک حاضر رہا کرو گے اور ان کی گفتگو کو گہرے غور سے سنا کرو گے" وعدہ تو کرنے کو میں نے کر لیا۔ لیکن شومئ قسمت کہ اسے پورا کرنے کی سعادت میسّر نہ ہوئی۔

چند ہفتوں کے بعد والد دوبارہ لاہور تشریف لائے۔ اور مجھے اپنے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں لے گئے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو جب ہم باپ بیٹا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے تو عاشق بٹالوی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں اعترافِ جرم پہلے ہی سے

کر چکا تھا۔ علیک سلیک کے بعد والد صاحب نے فرمایا "اقبال ہیں جاتے ہوئے اسے ہدایت کر گیا تھا کہ ہر روز تمہارے پاس آیا کرے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نالائق ایک دفعہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچا"، ڈاکٹر صاحب بولے "بھئی فقیر آخر جو کام باپ نے نہ کیا ہو وہ بیٹا کیوں کرے" اس پر طویل قہقہہ پڑا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی ہنسی میں کچھ دوستانہ شکوہ کی ملاوٹ بھی تھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ہر وقت ایک عالم کی صحبت میں بیٹھے رہتے تھے اس کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ جب اس عالم کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک نادر اور ضخیم کتاب لکھی اس پر مجھے ندامت کا مزید احساس اس قدر شدید ہوا کہ میں اس واقعہ اور بزرگ سے متعلق ڈاکٹر صاحب سے مزید تفصیل بھی دریافت نہ کر سکا۔

ابتدائی ملاقاتوں کے بعد علامہ اقبال کی ذات سے اتنا لگاؤ ضرور ہو گیا تھا۔ کہ والد جب بھی گھر پر آتے تو عام طور سے علامہ کا تذکرہ رہتا۔ کبھی ہم پوچھتے۔ کبھی وہ خود ہی بیان کرتے۔ بیشتر واقعات جو میں نے اس زمانہ میں والد محترم سے سُنے وہ شاعرِ مشرق کی شخصیت کا ایک خاص پہلو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں۔ یہ پہلو سوز و گداز اور جذب و وجدان کا پہلو ہے۔

ایک واقعہ مجھے اب تک یوں یاد ہے۔ جیسے اسی گھڑی سننے میں آیا ہو۔ ایک شام والد صاحب علامہ کے ہاں سے لوٹے اور آتے ہی یہ عجیب حکایت بیان کی۔

"ایک عجیب بات سنو۔ کل صبح میں اقبال کے ہاں گیا تو وہ گویا میرے منتظر بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کھل گئے۔ اور کہا اچھا ہوا فقیر تم آ گئے۔ سنا ہے کہ داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں آج کل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں۔ ان سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے یہ وعدۂ ایزدی ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز اور سربلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے۔ اچھا

ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اکیلے یہ زحمت کون کرے۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اور چلنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ علامہ مرحوم ہاتھ پاؤں ہلانے میں ہمیشہ بہت تامل کرتے تھے۔ دو قدم چلنا ہو تو اس کے لیے گھنٹوں پہلے تیاری کی ضرورت پڑتی تھی۔ چنانچہ داتا گنج بخشؒ کے سفر کا فیصلہ ہوتے ہی انہوں نے علی بخش کو آواز دی اور کہا دیکھو ہم باہر جا رہے ہیں۔ ذرا جلدی سے فقیر کے لیے حقہ بھرو اور بھاگ کر کچھ سوڈا لیمن وغیرہ لے آؤ۔ اس اہتمام میں حسبِ معمول جانے کتنا وقت نکل گیا۔ جب صبح سے دوپہر ہو گئی تو میں نے کہا بھئی اقبال تمہارا کہیں جانے والے کا ارادہ تو ہے نہیں۔ یونہی وقت ضائع کر رہے ہو میں تو اب گھر چلا۔ اقبال اس پہ کچھ چونک سے پڑے۔ اور کہا ہاں بھئی اب تو واقعی دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ وعدہ کرو کہ شام کو ضرور آؤ گے کچھ بھی ہو ہمیں ان بزرگ کے پاس ضرور جانا ہے۔ میں وعدہ کر کے چلا آیا۔ سہ پہر کو پھر پہنچا۔ لیکن پھر اسی طرح حقہ اور سوڈا لیمن میں دن ڈھل گیا۔ میں نے اقبال سے اس تساہل کا شکوہ کیا تو اقبال بہت ہی انکسار سے کہنے لگے۔ بھئی اس دفعہ اور معاف کر دو صبح ضرور چلیں گے۔

اگلی صبح میں عمداً دیر سے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ اقبال کو دیکھا تو ان کی عجیب کیفیت تھی۔ رنگ زرد چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گزر گیا ہو میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو تو کہوں! آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا کہ علی بخش نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا بلا لو۔ ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمائیے؟ آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے۔ اجنبی بولا "ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں" اور اس کے بعد مثنوی کا مشہور شعر پڑھا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
تو بنائی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

کچھ پوچھو نہ کہ مجھ پر کیا گزر گئی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے قطعی اپنے گرد و پیش کا

احساس جاتا رہا۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لیے دوبارہ نظر اٹھائی۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سراغ نہیں ملا۔"

والد مرحوم نے یہ واقعہ پہلے مجھے اور دوبارہ ایک دفعہ میرے پرانے دوست عاشق بٹالوی کو سنایا۔ جب عاشق بٹالوی نے کسی کا حوالہ دیئے بغیر ڈاکٹر صاحب سے اس واقعہ کی تصدیق چاہی تو انہوں نے فوراً کہا کہ "تمہیں یہ واقعہ فقیر نجم الدین سے معلوم ہوا ہوگا۔ کیونکہ یہ میں نے صرف انہیں کو سنایا تھا۔"

والد محترم نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق ایک اور واقعہ سنایا کہنے لگے۔

"میں ایک دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ اکیلے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں میں نے کہا خیر باشد! گھر میں تو سب لوگ بخیر و عافیت ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں سب بخیریت ہیں۔ میں نے پوچھا تو پھر آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دینے کی بجائے میری طرف ایک خط بڑھا دیا جو لندن سے اسی دن ان کے نام آیا تھا۔ جو خط انگلستان کے ایک پروفیسر[1] کی طرف سے تھا۔ جس نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ میں نے تعجب سے کہا۔ اس خط میں ایسی کون سی بات ہے کہ تم نے رونا شروع کر دیا، تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ دوسرے ملکوں کے اہل علم تمہارے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور یورپ کے لوگوں کو بھی اس سے آشنا کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت تک برابر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے۔ مجھے اس بات پر رونا آگیا کہ جس قوم کے دل میں احساس خودی پیدا کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی تھی وہ نہ تو پوری طرح اس کا مطلب سمجھ سکتی ہے اور نہ اس کی قدر کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ میرے

---

[1] کیمبرج یونیورسٹی کے معلم شرقیات پروفیسر نکلسن جنہوں نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتاب میں نے ان کے لیے نہیں لکھی۔"

والد محترم سے ڈاکٹر صاحب کو بے حد محبت تھی۔ چنانچہ وہ جب والد صاحب سے گفتگو کرتے تھے تو اس کا انداز کچھ ایسا بے تکلفانہ ہوتا تھا جس میں بیگانگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عام محفلوں میں گفتگو کرتے وقت کوئی لطیفہ پھبتی یا چٹکلہ ہوا جملہ ایسا کہہ جاتے تھے کہ خشک سے خشک بحثیں بھی بامزہ معلوم ہونے لگتیں۔ بے تکلف دوستوں کے ساتھ جب گفتگو ہوتی۔ تو اس کا رنگ ہی اور ہوتا۔ کبھی ان کی طبیعت لہراتی تو ایک آدھ فقرہ یا کوئی پھبتی کستے۔ والد محترم کو اکساتے وہ پہلے تو کچھ دیر ضبط کئے بیٹھے رہتے فقرے اور پھبتیاں سنتے اور ہنس کے چپ ہو رہتے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان پر بھی یہی رنگ چھا جاتا۔ اور وہ بھی خوش طبعی پر اتر آتے کبھی کبھی تو یہ نوک جھونک اس حد تک لطف کا پہلو لیے ہوئے ہوتی کہ ہم ایسے نیاز مند بھی اس سے لطف اٹھاتے۔ لیکن جب خوش طبعی اور بے تکلفی کا رنگ ذرا تیز ہو جاتا تو مجھے اس محفل سے اٹھا دیا جاتا۔

ڈاکٹر صاحب کو قدرت نے عظمت کے جس بلند ترین مقام پر پہنچایا تھا۔ اس کا حال آپ جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں کی خوبیوں کا ذکر تو اکثر موقعوں پر کرتے رہتے تھے۔ والد محترم کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور اسلامی تاریخ سے تو وہ خاص طور پر بڑا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ کبھی اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا ذکر آتا تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ اقبال جب کسی سے میرا تعارف کراتا ہے تو یہ بات خاص طور پر کہتا ہے کہ میرے دوست فقیر سید نجم الدین اسلامی تاریخ پر بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا دل عشق رسولؐ نے گداز کر رکھا تھا زندگی کے آخری زمانہ میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آجاتا تھا تو ڈاکٹر صاحب

کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے تھے اور آخر عمر میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز بھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ تک مکمل سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔

جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو والد محترم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے بڑے تپاک سے ملے۔ اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے حالات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد محترم نے اثنائے گفتگو میں کہا "اقبال تم یورپ ہو آئے۔ مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے"۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ یعنی چہرے پر زردی چھا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے۔ "فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا"۔

شروع شروع میں میں والد محترم کی ہدایت کے باوجود ڈاکٹر صاحب سے دور رہا۔ البتہ جب کبھی والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذکر چھڑ جاتا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے۔ ان کی سادگی۔ خلوص۔ علمی تبحر اور شاعرانہ عظمت کا ذکر کر کے میرے شوق کو برانگیختہ کرتے۔ میں کبھی کبھی ان کی باتیں سن کے سوچتا کہ سچ مچ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مدتیں ہو گئیں خدا نے چاہا تو انہیں دنوں ان کی زیارت کروں گا کئی بار اپنے آپ سے اس قسم کا عہد کیا لیکن اور قصوں میں پڑ کے بھول گیا۔ پھر جب سرشوری اور نادانی کا وہ زمانہ جسے شباب کا ابتدائی دور کہنا چاہیے۔ ختم ہوا۔ خیالات میں کسی قدر پختگی آئی۔ تو دل پر ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا نقش زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ طبیعت ان کی طرف خود بخود کھنچنے لگی۔ اور میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے میں یہ کیفیت ہو گئی کہ جب کبھی فرصت کا تھوڑا سا وقت ملتا تھا میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اس "حضوری" میں ایسی لذت پائی کہ جو زمانہ دوری میں بسر ہوا تھا اس پر افسوس ہوتا تھا۔ اور بار بار خیال

آتا تھا کہ اے کاش ہم نشینی و یک جائی کی سعادت پہلے نصیب ہوئی ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ میں نے جب انہیں دیکھا۔ کچھ نہ کچھ سوچتے ہی پایا۔ اور کبھی کبھی تو انہیں دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نگاہیں افق کے اس پار بلکہ افلاک کی حد سے بھی آگے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایسے موقع پر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ خود گفتگو کا سلسلہ چھیڑے۔ ڈاکٹر صاحب خیالات میں مستغرق ہوتے تھے۔ اور لوگ چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے یا گفتگو بھی ہوتی تھی تو کچھ اکھڑی اکھڑی یعنی کسی نے کوئی بات پوچھی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے جواب میں ایک آدھ مختصر سا جملہ کہہ دیا۔ اور پھر خاموشی چھا گئی لیکن یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ جب وہ بحث و گفتگو کی طرف جھک پڑتے تھے تو گھنٹوں مسلسل باتیں کرتے چلے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات کا ایک سیلاب ہے جو امڈا چلا آ رہا ہے۔

ایک دفعہ ان کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی۔ یعنی باتیں کرنے کے "موڈ" میں تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ فرمایا! "ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوتِ شرکت دی اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ چائے پی کے چلے نہ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے ہم لوگ چائے پی چکے۔ تو ڈاکٹر لوکس آئے۔ اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے۔ اقبال! مجھے بتاؤ کیا تمہارے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا۔ اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی۔ انہوں نے قرآنِ کریم عربی میں منتقل کر دیا یا پھر یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی۔ میں نے کہا یہ عبارت ہی اتری تھی ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا۔ "اقبال تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے"۔

"میں نے کہا ڈاکٹر لوکس! یقین! میرا تجربہ ہے! مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر

عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہوگی ۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہوگیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ پر یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے؟"

وہ کہنے لگے "نہیں یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے۔ لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔"

تھوڑی دیر توقف کے بعد کہنے لگے "ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحر مواج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل کی تلافی کر دی۔

یہ کہہ کے وہ لمحہ بھر کے لیے رک گئے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ پھر یکبارگی کہنے لگے۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے

متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے۔ تو اپنی رُوح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔"

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے واقعات میں ان کے "نائٹ ہڈ" کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جن دنوں انہیں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب کی سیاسی فضا خاصی مکدّر تھی۔ ترک موالات کی تحریک کا زمانہ تھا۔ سودیشی کی تحریک زور پر تھی۔ انگریزی مال کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ لوگ سرکاری ملازمتوں اور خطابات کے بائیکاٹ کو بھی فرضِ عین سمجھتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کو خطاب ملا۔ تو ان کے بعض دوست بہت جز بز ہوئے۔ اخباروں میں مضامین چھپے۔ فکاہی کالموں میں ان پر چوٹیں کی گئیں۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خان اور سالک و مہری اخبار نویسی کے بڑے چرچے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ روز نہیں تو دوسرے تیسرے دن ان کے ہاں ضرور آتے تھے اور گھنٹوں صحبتیں رہتی تھیں۔ لیکن سب سے پہلے انہیں حضرات نے مخالفت کی۔ اور سالک صاحب نے تو ایک نظم بھی لکھ ڈالی جس کا یہ چبھتا ہوا مصرع "سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال" ان دنوں اکثر لوگوں کی زبان پر تھا۔ سالک صاحب کا بیان ہے کہ میں یہ اشعار لکھنے کے بعد اتنا نادم ہوا کہ مجھے عرصے تک ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جی کڑا کر کے حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے انداز میں میں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں مولانا ظفر علی خان کو بھی اسی طرح ندامت کا احساس تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو

اپنے دوستوں کے اس طرزِ عمل پر نہ حیرت تھی نہ افسوس۔ بلکہ وہ یہ مضامین اور اشعار سن سن کے مسکراتے۔ اور کبھی کبھی تو ان اشعار کو پڑھوا کے سنتے اور داد دیتے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خطاب کی مبارک باد دینے حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب پلنگ پر نیم دراز حقہ پی رہے تھے۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا پہلے مبارکباد دی۔ پھر لوگوں کے اعتراضات کا قصہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں مجھے یہ خطاب کس طرح ملا۔ جس زمانے میں خطاب کی سفارش ہوئی۔ اس سے پہلے پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے مجھے بلا کے کہا کہ مجھ سے گورنمنٹ نے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں۔ اور میں تمہارا نام خان صاحب کے خطاب کے لیے تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا میں اپنے لیے کوئی خطاب نہیں چاہتا۔ آپ زحمت نہ فرمائیے۔ وہ کہنے لگے اس قدر جلد فیصلہ نہ کرو بلکہ پہلے اچھی طرح غور کر لو۔ میں نے کہا۔ میں غور کر چکا مجھے خطاب کی ضرورت نہیں۔

دو تین دن کے بعد پھر سر شادی لال کا پیغام ملا۔ کہ مجھ سے مل جاؤ۔ میں نے پیغام بر کی زبانی کہلا بھیجا کہ خطاب کے سلسلہ میں مجھ سے گفتگو کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ میں جو فیصلہ ایک بار کر چکا۔ ہاں اگر کوئی اور بات ہے۔ تو مجھے آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ اس واقعہ کو کچھ دن گزرے تھے۔ کہ میکلگن صاحب گورنر پنجاب نے مجھے بلا بھیجا۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے آیئے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملواؤں ایک انگریز انہیں دنوں لاہور آیا تھا۔ اس نے میرا نام سن رکھا تھا۔ انگریزی میں اسرارِ خودی کا ترجمہ بھی پڑھا تھا وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ غرض خاصی دیر تک صحبت رہی جب میں رخصت ہونے لگا تو ایک شخص یہ پیغام لے کر آیا کہ گورنر صاحب نے کہا ہے مجھ سے ملتے ہوئے جائیں! میں ان کے کمرہ میں گیا۔ تو انہوں نے کہا۔ اقبال! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے تمہاری ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تساہل روا رکھا ہے۔ میں اس وقت خطابات کی سفارش کر رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ "نائٹ ہڈ"

کے لیے تمہاری سفارش کی جائے! لیکن اس سے قبل معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں: (واضح رہے کہ اس زمانے میں حکومت کا یہ طریق کار تھا کہ خطاب پانے والے شخص کی طرف سے اس امر کا اطمینان کر لیا جائے) ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اسلام سماجی امتیازات SOCIAL DISTINCTION کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا لیکن اگر میرا یہ انکار گورنمنٹ کے جذبات مجروح کرنے کا باعث ہو تو مجھے تامل نہیں! میرے اس جواب سے میکلگن صاحب کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔

گورنر پنجاب ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بارے میں گفتگو کر چکے تو کہنے لگے شمس العلماء کے خطاب کے سلسلہ میں اس دفعہ پنجاب کی باری ہے۔ میں نے چند سر کردہ مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ موزوں نام تجویز کریں۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی مناسب نام ہو تو بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ اس شرط پر بتاتا ہوں۔ کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے۔ میکلگن صاحب نے اس اقرار سے پہلے کچھ تامل کیا۔ اور پھر کہا۔ اچھا تم نام بتاؤ۔

میں نے اپنے استاد مولوی سید میر حسن پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ کا نام لیا۔ میکلگن صاحب فرمانے لگے اس سے قبل یہ نام نہیں سنا! اچھا یہ بتائیے کہ انہوں نے کون کونسی کتابیں تصنیف کی ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ کہ انہوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف" آپ کے سامنے موجود ہوں جسے گھر بلا کر "سر" کے خطاب کی پیشکش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب گورنر پنجاب سے رخصت ہوئے اور چند قدم جا کر پھر واپس آ گئے، اور کہا ایک اور شرط بھول گیا ہوں کہ اگر شمس العلماء کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو میرے ضعیف العمر استاد کو یہ سند لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔

یہ شرط بھی مسٹر میکلگن نے منظور کر لی۔ چنانچہ مولوی صاحب کے خطاب کی سند ان کے

صاحب زادے سیّد علی نقی شاہ کو جو گورنمنٹ ہاؤس میں بطور معالج ملازم تھے گورنر پنجاب نے عطا کی اور انہوں نے سند کو اپنے والد کے پاس سیالکوٹ پہنچا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے خطاب پانے کا واقعہ صرف اسی قدر رہے جسے لوگوں نے بہت طول دیا۔ اس پر حاشیہ آرائیاں کیں اور اس سارے قصہ کو اس طرح پیش کیا۔ گویا ڈاکٹر صاحب خطاب پا کے سچ مچ اپنے عقائد سے دست بردار ہو گئے تھے۔ برطانیہ کے معاملہ میں ان کی جو رائے خطاب پانے سے پہلے تھی۔ بعد میں بھی وہی رہی۔ انہوں نے خطاب پانے کے بعد جو نظمیں کہی ہیں۔ ان میں برطانیہ کی حکمت عملی پر جا بجا طنز کیا ہے۔ بلکہ طنز کے یہ نشتر پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے ہیں۔

میں جب کبھی اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ! اللہ! ڈاکٹر صاحب کتنے بلند کردار اور شریف النفس شخص تھے کہ اس موقع پر بھی استاد کو نہ بھولے اب نہ مولوی میر حسن جیسے استاد ہیں۔ نہ اقبال جیسے شاگرد اور پھر ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اقبال کی شہرت ہندوستان سے نکل کے یورپ میں پہنچ چکی تھی۔ دوسرے ملکوں کے علمی حلقوں میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا اور مولوی میر حسن جو پہلے تھے اب بھی وہی تھے۔ معدودے چند لوگوں کے جنہیں ان کی خدمت میں بیٹھنے یا ان سے پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ عام لوگ ان کی عظمت سے واقف نہ تھے۔

پھر بھی اقبال ہمیشہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے اور اس معاملہ میں حفظ مراتب سے غافل نہیں ہوئے۔

بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت کے تذکرہ کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہزارہا عقیدت مند دنیا کے کن دور دراز گوشوں میں موجود تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ پلنگ پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے مجھے دیکھ کے کتاب بند کر دی اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں پلنگ سے ذرا ہٹ کے ایک قالین پڑا تھا جس کی رنگت اور گل

بوٹے آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ نیا قالین خریدا ہے۔ کہنے لگے اس قالین کا قصہ بھی عجیب ہے۔ آج صبح ایک شخص جس کا میں نام تک نہیں جانتا یہ قالین لے کے آیا اور کہنے لگا میں دو تین دن ہوئے فریضہ حج ادا کر کے لاہور پہنچا ہوں۔ ایران کی سیر کا مدّت سے شوق تھا۔ اس لیے واپسی پر ایران کا راستہ اختیار کیا۔ طہران میں جن صاحب کے ہاں میرا قیام تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں اور حج کر کے اپنے وطن واپس جا رہا ہوں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تم نے کبھی حضرتِ اقبال کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کئی مرتبہ! یہ سنتے ہی وہ اٹھ کے میری طرف بڑھے۔ میری آنکھوں کو بوسہ دیا۔ اور پھر دیر تک بڑے اشتیاق سے آپ کے حالات پوچھتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو گھر میں سے یہ قالین نکال لائے اور کہنے لگے کہ لاہور پہنچ کر میری طرف سے یہ قالین ان کی خدمت میں پیش کر دینا یہ قالین آپ کے ایک ایرانی عقیدت مند کا تحفہ ہے جو میں اس کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کرنے حاضر ہوا ہوں۔

اس وقت میرے سامنے ایک کتاب پڑی ہے۔ جو اسپین کی تاریخ سے تعلّق رکھتی ہے۔ اس کتاب کا نام SPAIN FROM THE SOUTH. ہے اور مصنف کا نام ہے J.B.TREND کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب کے دستخط ہیں۔ اور ان کے نیچے ۲ جنوری ۱۹۳۵ء لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب مجھے ڈاکٹر صاحب نے مرحمت فرمائی تھی اور میں اسے بڑی عزیز متاع سمجھتا ہوں۔ اس کتاب پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ جب وہ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو میں والد محترم کی معیّت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان دنوں والد صاحب کے فیضِ صحبت سے مجھ میں اسلامی تاریخ کا خاصا ذوق پیدا ہو چلا تھا۔ سپین کے متعلق کئی کتابیں جن میں سکاٹ اور لین پول کی تصانیف شامل تھیں۔ میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ میں نے یہی تذکرہ چھیڑ دیا اور اسپین کے اسلامی عہد کی تاریخ کا ایک حصّہ جو مجھے حفظ ہو گیا تھا۔ فرفر سنا دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ پھر اسپین کی موجودہ حالت کا ذکر چھڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے

سفر میں سپین بھی گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں انہوں نے مسجد قرطبہ پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ جو ان کی مشہور نظموں میں سمجھی جاتی ہے۔ وہ جب قرطبہ پہنچے اور وہاں کی مسجد دیکھنے گئے۔ جو انقلاب زمانہ کی بوقلمونی سے گرجا بن چکی ہے۔ تو انہوں نے ایک پادری سے جو مسجد کی نگہبانی پر مامور تھا۔ وہاں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی پادری نے یہ سن کے تامل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تعجب ہے تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو، حالانکہ ہم نے تم سے کبھی اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ پادری اس فقرہ سے کسی قدر متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں بڑے پادری سے پوچھ کے آتا ہوں۔ لیکن جب تک وہ واپس آیا۔ ڈاکٹر صاحب نماز پڑھ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد کہا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے سپین پر آٹھ سو برس حکمرانی کی۔ لیکن اس سرزمین میں کسی مسلمان کا نشان مزار تک نظر نہیں آیا۔

اس سفر میں وہ اٹلی بھی گئے۔ اور وہاں انہیں مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا یہ ساری کیفیت میں نے خود ان کی زبانی سنی ہے۔ انہوں نے خود مسولینی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ بلکہ جن دنوں وہ روما میں مقیم تھے۔ مسولینی نے اپنے سٹاف کے آدمی کے ذریعے انہیں کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ اور مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے۔ وہ ایک بڑے وسیع کمرے میں میز کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تھے تو وہ پیشوائی کے لیے بڑھا۔ اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ آپ نے "ڈسپلن" کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں۔ تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو گا لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مسولینی کے ذہن میں آسانی سے آجاتی۔

ڈاکٹر صاحب نے مسولینی کو یہ مشورہ بھی دیا۔

TURN YOUR BACK TOWARDS EUROPE

(یعنی یہ کہ یورپ جس معاشرہ کی ترقی کا داعی ہے تم اس کی تقلید سے اجتناب کرو)

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبا کو اٹلی بلائیے۔

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو، اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں"۔ مسولینی نے حیران ہو کر کہا۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ثقافتی توانائی کی CULTURAL FORCES جگہ EVIL FORCES "محرکات شر" لے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے پیغمبر نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی۔ کہ جب مدینہ منوّرہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

یہ حدیث سنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا WHAT AN EXCELLENT IDEA

یعنی، کتنا حسین تخیل ہے:

(تحقیق کے طالب حضرات اس نکتہ پر غور و تجسّس کر سکتے ہیں۔ کہ ایٹمی توانائی اور جنگی تباہی کے اس ہولناک دور میں یہ نظریہ کس قدر مصلحت اور افادیت لیے ہوئے ہے)

ڈاکٹر صاحب مسولینی سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ اس سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور تقاضا کرنے لگے۔ کہ آپ ہمارے لیڈر کے متعلق اپنی رائے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگ راستہ روکے کھڑے تھے۔ اور ہجوم سے موٹر نکال کے لے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ آخر مسولینی کے سٹاف کے آدمیوں نے کہا کہ ان لوگوں سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ کہہ دیجئے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے ہجوم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "مسولینی بغیر بائبل کے لوتھر ہے"۔ یہ فقرہ الحاوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور ہجوم میں بار بار دہرایا گیا۔ لوگ سن کے خوشی سے ناچنے لگے اور اسی وقت بڑے بڑے پوسٹر جن پر یہ فقرہ درج تھا۔ چھاپ کے در و دیوار پر چسپاں کر دیئے گئے۔

مسولینی سے ڈاکٹر صاحب کی اس ملاقات اور ان کی ایک نظم سے جو انہوں نے مسولینی کے متعلق لکھی ہے لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا رجحان فاشزم کی جانب تھا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسولینی نے اپنے ملک کے لوگوں میں جو تنظیم پیدا کر دی تھی اسے وہ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اسلام کی حقیقی روح بھی تنظیم ہے۔ اور ان کی عادت تھی۔ کہ جب کسی تحریک میں انہیں کوئی ایسی بات نظر آتی تھی جو اسلامی اصولوں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی۔ تو وہ اس کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے ورنہ یہ سب کو معلوم ہے کہ جب مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا۔ تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھی۔ جس میں یورپ والوں کی ہوس ملک گیری کا ذکر نہایت تلخ انداز میں کیا گیا ہے۔

اپنے عہد کے جن بزرگوں سے ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان میں اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ اکبر مرحوم سے میری بڑی دلچسپ خط و کتابت رہی ہے اور میرے پاس وہ تمام خطوط بحفاظت موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد میں نے چودھری محمد حسین صاحب کو ان خطوط کی اشاعت کی جانب

متوجہ کیا۔ اور انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ انہیں خود ان خطوں کو چھاپنے کا خیال ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے ڈاکٹر صاحب کے نام جو خط لکھے ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ جس سے گہری وابستگی اور تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو آم بہت مرغوب تھے۔ ایک مرتبہ اکبر نے الہ آباد سے ان کے لیے لنگڑا آم کی ایک پیٹی بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی رسید میں یہ شعر لکھ بھیجا۔ ؎

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا

ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے ضرور قبول ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ دعا کا اثر فوراً ظاہر ہو۔ بعض دعائیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن کا اثر کہیں موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے۔ اور نظامِ کائنات بہت وسیع ہے ڈاکٹر صاحب کے اس قول کی تصدیق ان کی زندگی کے واقعات سے ہوتی ہے۔ جو لوگ ان کی زندگی کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ جب وہ قریب قریب اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے۔ تو حضرت مجدد الف ثانی کی درگاہ میں حاضر ہو کے دعا کی۔ کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے جسے وہ اپنی زندگی میں اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ لیکن اس واقعہ کو بھی پانچ چھ برس گزر گئے۔ اور ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ایک دن شام کو وہ گھر گئے۔ تو دیکھا۔ کہ جاوید کی والدہ طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کے بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ "الٰہی! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما"۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہٗ تولد ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو جاوید میاں سے جس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو ان کی خدمت میں روز حاضر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب طبعاً بڑے

خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ لیکن جب کبھی وہ جاوید کو آواز دے کے بلاتے۔ اسے کھیلتے ہوئے دیکھتے یا احباب اس کا ذکر کرتے۔ تو پدرانہ شفقت ان کے دل کو گداز کر دیتی۔ اور ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں کبھی کبھی رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ پیشانی پر زاویے ابھرتے اور مٹ جاتے۔ وہ جاوید سلمہٗ کو نصیحتیں کرتے۔ اپنے پاس بیٹھنے پر زور دیتے۔ لیکن کبھی کبھی میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جاوید کا ذکر کرتے کرتے ان کا دل ڈوب سا جاتا۔ اور وہ یک بیک خاموش ہو جاتے۔

جن دنوں ڈاکٹر صاحب افغانستان کی سیاحت سے واپس آئے۔ تو میں والد محترم کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ والد محترم نے اس موقع پر پیام مشرق کی اس نظم کا ذکر چھیڑ دیا جس میں شاہ افغانستان سے خطاب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تازہ کتاب ''مسافر'' کا ذکر کیا۔ جو انہوں نے افغانستان کے سفر کے زمانے میں لکھی تھی۔ اتنے میں جاوید میاں باہر سے کھیلتے کھیلتے کمرے میں آ گئے۔ والد محترم نے ان کا ہاتھ پکڑ کے بڑی شفقت سے پوچھا۔

''تمہارا باپ تو بادشاہوں کو سبق دیتا ہے۔ بڑے ہو کے تم کیا کرو گے؟''

یہ سن کے ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ اور کہنے لگے ''نجم الدین۔ میرے دل کا بادشاہ تو یہی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے بڑی شیفتگی تھی۔ سر عبدالقادر کے قول کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ماں کے دودھ کے ساتھ اسلام ان کی رگ و پے میں نفوذ کر گیا تھا انہوں نے اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ بڑے غور سے کیا تھا۔ اور اسے خوب سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے دوسرے مذاہب کے متعلق بھی جو کچھ کہتے تھے۔ وہ بہت وقیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پادری ان سے ملنے آیا۔ اور اثنائے گفتگو میں پوچھنے لگا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

فرمایا۔ اس سے پہلے کہ میں اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کروں آپ بتائیے کیا عیسویت کے نزدیک جناب مسیح علیہ السلام اسی طرح خدا کے بیٹے تھے جس طرح میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔ یا آپ اپنے باپ کے بیٹے ہیں یا محض استعارہ کے طور پر مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے پادری نے جواب دیا۔ نہیں یہ تو صرف استعارہ ہے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''تو بس اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔''

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو لندن کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ جہاں صرف اسلامیات کے متعلق تقریریں ہو رہی تھیں۔ اس اجتماع میں مختلف نسلوں کے تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ لوگوں کے اصرار پر حکیم الامت نے بھی ایک تقریر کی۔ جس میں انہوں نے اسلام کے اصولوں پر روشنی ڈالی۔ جب وہ تقریر ختم کر چکے۔ تو ایک انگریز ان کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا ہے اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی کو برسرِ عام یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب صحیح معنوں میں مرد خود آگاہ تھے۔ یعنی اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے زیادہ اپنی خامیوں پر نظر رکھتے تھے۔ انہیں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ اکثر لوگوں کو ان سے مل کے مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگ ان کا کلام پڑھ کے اپنے ذہن میں ان کے متعلق جو نقشہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس پر وہ پورے نہیں اترتے چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا۔ کہ آپ لوگوں سے میرا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں مجھ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے اس پر مجھے اعتراض تو نہیں۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ انہیں مجھ سے مل کے کہیں مایوسی نہ ہو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بعض لوگ انہیں شاعر سمجھ کے ان سے شاعروں کے سے تکلف اور تصنع کی توقع رکھتے تھے۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے۔ جو ان سے ملنے آتے تھے اور چھوٹتے ہی شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے تھے۔ خاص طور پر بعض شعرا کا جو ان کی طبیعت سے ناواقف تھے۔ یہی انداز تھا۔

وہ اس خیال سے ان سے ملنے آتے تھے۔ کہ گھڑی دو گھڑی بیٹھیں گے۔ اپنا کلام سنائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام سنیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا انداز عام شاعروں سے مختلف تھا۔ انہیں خود نمائی سے نفرت تھی۔ نہ مشاعروں میں جاتے تھے۔ نہ نجی صحبتوں میں شعر سنتے اور سناتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ جو میں نے خود ان کی زبانی سُنا تھا۔ نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب ان کی دعوت پر ڈیرہ دُون تشریف لے گئے۔ وہاں اتفاق سے ان دنوں نواب صاحب رام پور بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے نواب ذوالفقار علی خان کو کھانے پر بلایا۔ اور ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا کہ سنا ہے آپ کے دوست ڈاکٹر اقبال بھی ان دنوں یہیں ہیں۔ انہیں اپنے ساتھ ضرور لے آئیے۔ مجھے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے نواب ذوالفقار علی خاں نے ذکر کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب نواب صاحب نے اصرار کیا۔ تو کہنے لگے۔ کہ میں ایک شرط پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ کہ نواب صاحب رام پور جو شاعروں کے بڑے قدر دان سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ خود بھی شعر کہتے ہیں نہ تو مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش کریں۔ نہ خود اپنے اشعار سنائیں گے۔ نواب ذوالفقار علی خان نے یہ شرط بادلِ نخواستہ منظور کر لی۔ نواب صاحب رام پور کو بھی اس بات کی اطلاع کر دی گئی چنانچہ انہوں نے اپنا کلام سُنایا۔ نہ ڈاکٹر صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کی غیروں کو تو جانے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے خاص خاص نیازمندوں کو بھی کبھی کبھار ہی اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ مجھے سالہا سال انکی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوتا رہا لیکن صرف ایک مرتبہ انکی زبان سے ان کا ایک شعر سُنا۔ یہ شعر "بالِ جبریل" میں موجود ہے لیکن اس زمانے میں "بالِ جبریل" ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کا مسودہ ضرور زیرِ ترتیب تھا۔ وہ شعر یہ تھا ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر ۔۔۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

تصورِ مذہب

اقبالؒ کے نزدیک مذہبی زندگی کے تین دور ہیں۔ استقراری۔ اجتہادی اور استشہادی۔ اپنی ابتدائی اور جاہلی حالت میں مذہب عقیدے کی شکل اختیار کرتا ہے، جسے غیر مشروط طور پر یعنی اس کے مطلب اور مقصد کو سمجھے بغیر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مذہب کا یہ تصور کسی قوم کی خارجی سیاسی اور تمدنی تاریخ کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے تو واقعی بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن اس قوم کے افراد کی باطنی نفسی تربیت اور توسیع کے راز پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ دوسرے دور میں مذہب کی تاسیس و تشکیل مابعد الطبیعات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس منزل پر مذہبی عقیدے کو صرف تسلیم نہیں ہی کیا جاتا، بلکہ عقلی طور پر اس کی حقانیت بھی پہچانی جاتی ہے اور اس کے آخری سرچشمہ اور مصدر کو سمجھنے کی کوشش جاتی ہے۔ مذہب کی اس مابعد الطبیعاتی ترتیب و تشکیل کے بعد جس پر کائنات کے انضباط میں منطقی طور پر خدا کو ایک مخصوص درجہ حاصل ہے، ایک نفسیاتی منزل آتی ہے جہاں انسان میں آخری حقیقت کا علم حاصل کرنے کی بجائے اس کا شہود حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعات کی جگہ اب نفسیات لے لیتی ہے اور مذہب ذاتی استشہاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انسان اس منزل پر اپنے تمام فکری، جذباتی اور ارادی عناصر کی ترتیب و تعدیل کے بعد اپنے اندر ایک خاص قسم کی زندگی اور قوت پاتا ہے اور اسے اپنی آزاد شخصیت کا تجربہ حاصل ہوتا ہے ——— اقبال کے نزدیک انسان کے تجربے ہی کی صحیح تشریح و تعریف کا نام مذہب ہے۔

اقبال کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تجربے کے لیے عمومی مدارج کے علاوہ ایسے اور درجے بھی ممکن ہیں جو مختلف زمانی اور مکانی اشکال پر متشکل ہو سکتے ہیں اور جہاں عقلیت کو وہ دخل

لہ استفادہ از اقبال شناسی اور محمد مولنہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۴۰ ماخوذ از مقالہ سید کرامت حسین جعفری

حاصل نہیں ہوتا، جو اسے ہمارے تجربے کی توجیہ و تشریح میں حاصل ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آخری درجے پر، جسے ہم مذہبی درجہ کہہ سکتے ہیں، انسانی تجربہ لازماً انفرادی اور ناقابل ابلاغ ہوگا۔ لیکن اس کے انفرادی ہونے سے اس کے ناممکن ہونے کا نتیجہ نہیں نکلتا اور نہ ہی اس کے ناقابل ابلاغ ہونے سے اس کے بے سود ہونے کا نتیجہ نکلتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ حقیقت کے ذاتی شہود کے بعد انسانی خودی کو وسیع ہونے کا موقع ملتا ہے اور اسے اپنے یکتا ہونے کا تجربہ حاصل ہوتا ہے یہ تجربہ یقیناً عقلی تجربہ نہیں ہوتا، لہٰذا اسے عقلی اصطلاحات سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کو پانے کے لیے عقلیت کا راستہ کامیاب راستہ نہیں، مذہب ہی کا راستہ اس کے لیے موزوں ہے۔ عقلیت کا استعمال سائنس یا علم کے لیے کسی بہت بڑے خطرے کا باعث نہیں ہوتا۔ سائنس کا محل عقلیت کے فریب کی بنیاد پر بھی کھڑا رہ سکتا ہے مگر مذہب میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہاں خودی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ خودی کا محل فریب کی بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ غلط عقلیت صرف ادراک ہی کو بھٹکا سکتی ہے مگر غلط زندگی ساری شخصیت کو گمراہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال اس بات کا قائل ہے کہ مذہب ناممکن نہیں۔

مذہب کے امکان کے متعلق علم الطبیعات نے بھی اپنا پرانا رویہ تشکیک ترک کر دیا ہے۔ موجودہ سائنس کا رویہ اس سوال کے متعلق بڑی حد تک ایجابی ہے بقول پروفیسر ایڈنگٹن:

> "ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ علم الطبیعات کی اصطلاحات حقیقت کا جزئی انکشاف کرتی ہیں اور حقیقت کے دوسرے پہلو تک ان کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت کا دوسرا پہلو اس کے مادی پہلو سے ہمارے لیے کم اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے خیالات اور ارادوں کی نفسیاتی دنیا اتنی ہی اہم ہے جتنی وہ دنیا جسے ہم محسوس کرتے ہیں۔ اپنے مادی حواس کے توسل سے ہم صرف محسوسات کی بیرونی دنیا تک پہنچتے ہیں جس سے سائنس تعلق رکھتی ہے، لیکن ہماری خودی کے دوسرے عناصر ہمیں مادی زمان و مکان

18,536

کی دنیا سے کہیں اور لے جاتے ہیں۔"

یہ تو ہے مذہب کے امکان کے سوال کا علمی پہلو لیکن اقبال کے نزدیک اس سوال کا عملی پہلو بہت زیادہ اہم ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ موجودہ انسان اپنے نظریات کی وجہ سے ایک مہلک ابتلا میں پھنسا ہوا ہے، اس کی نیچریت نے اسے کائنات کی طاقتوں پر قدرت تو ضرور دے دی ہے لیکن اسے اس کے مستقبل کے یقین اور اطمینان سے محروم کر دیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ ایک ہی نظریے نے مختلف مذاہب میں مختلف اثرات پیدا کیے۔ سائنس کے نظریۂ ارتقاء نے اسلام کی دنیا میں تو رومی کے اس تخیل کو پیدا کیا کہ انسان کے لیے حیاتیاتی اور نفسیاتی لحاظ سے ایک بہت وسیع اور ہمیشہ بڑھنے والا مستقبل ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اسے جدوجہد کرنی چاہیئے لیکن اسی نظریۂ ارتقاء نے یورپ میں یہ تخیل پیدا کیا کہ انسان کے لیے اس کی موجودہ حالت کے علاوہ کسی اور معراج کی پذیرائی ممکن نہیں گویا ایک ہی نظریے نے اسلام کے ایک مفکر میں رجائیت اور یورپ کے مفکرین میں قنوطیت پیدا کی۔ چنانچہ موجودہ یورپ کا عام فرد اپنی عقلیت کے فریب میں گرا ہوا ہونے کی وجہ سے زندگی کی روحانیت سے واقف نہیں۔ اپنے اندرونی خیالات کی دنیا میں وہ خود اپنے آپ کو اپنے خلاف اور بیرونی حالات کی دنیا میں وہ اپنے آپ کو دوسروں کے خلاف پاتا ہے۔ اس کی خودغرضی، ہوسِ زر اور اقتصادی انتفاع نے جو اس پر مسلط ہیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا خون اور زندگی سے بیزاری پیدا کر دی ہے۔ کمیونزم اور فیشنزم دونوں کی بنیاد طبقاتی یا قومی تعصب، تنگ نظری، نفرت، نزاع اور مجادلے پر قائم ہے اور یہی انسان کی روحانیت کے دشمن ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ موجودہ ابتلا کا علاج نہ تصوف اور نہ کمیونزم اور نہ فیشنزم ہیں بلکہ اس کا علاج مذہب ہی ہے۔ مذہب انسان کو موجودہ زمانے کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے لیے تیار کر سکتا ہے اور اس دنیا میں اسے اپنی خودی حاصل کرنے اور آخرت میں اسے برقرار رکھنے کے قابل بن سکتا ہے۔ موجودہ کاروباری نزاعات، سیاسی آویزشات اور غیر انسانی نظامات سے پیدا شدہ مہالک کا واحد علاج مذہب ہے۔ ایسا مذہب نہ تو جاہلی عقیدہ، نہ پادریت اور نہ محض مجموعۂ رسوم

ہے ـــــ یہ ہے اقبال کے نزدیک مذہب کے امکان کے سوال کا عملی پہلو۔

شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کے پاس ایک شخص عبدالمومن کا تجربہ یوں بیان کیا گیا۔

"آسمان، زمین، خدا، جنت و دوزخ میرے لیے سب غائب ہو جاتے ہیں۔ جب میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو انہیں کہیں نہیں پاتا۔ جب میں کسی کے روبرو کھڑا ہوتا ہوں تو کسی کو اپنے سامنے نہیں دیکھتا، یہاں تک کہ میں خود بھی اپنے وجود کو نہیں پاتا، خدا لاانتہا ہے اسے کوئی نہیں گھیر سکتا یہی روحانی تجربے کی آخری حد ہے اور کوئی صوفی اس حد سے آگے نہیں جا سکتا۔"

اس پر شیخ احمد سرہندیؒ نے فرمایا۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تجربہ نے قلب کے ان گنت مقامات کا ابھی چوتھائی حصہ بھی طے نہیں کیا۔ اس مقام کے بعد اور مقام بھی ہیں۔ جو روح اور سر اخفی کہلاتے ہیں۔ ہر مقام کے اپنے مخصوص تجربات ہوتے ہیں اور یہ سب مقامات مل کر عالم امر کہلاتے ہیں۔ ان مقامات میں سے گزرنے کے بعد حق کے متلاشی پر بتدریج اسمائے الٰہی، صفاتِ الٰہی اور حقیقت الٰہی کے راز کھلتے ہیں۔"

اسلامی تصوف کے ایک بہت بڑے مجدد نے روحانی تجربے کو یوں بیان کیا ہے لیکن نفسیات کے لیے ایسا تجربہ بعید الفہم ہے کیونکہ نفسیات کے پاس ایسے الفاظ نہیں جو اس کی توضیح کر سکیں۔

اقبال کے نزدیک مذہب اور سائنس کے راستے اگرچہ مختلف ہیں تاہم دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی حقیقت کی تلاش۔ دونوں انسانی تجربے کی توضیح کے قائل ہیں۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ سائنس انسانی تجربے کو نفسیات یا عضویات کی روشنی میں دیکھتی ہے اور مذہب انسانی تجربے کی باطنی گہرائیوں کو دریافت کرتا ہے۔ یہ تجربہ ہرگز جذباتیت نہیں بلکہ اسے خاص طور پر غیر جذباتی حالت میں حاصل کرنے کے لیے اسلامی تصوف

عبادات میں سرود و سماع کی ممانعت کرتا ہے اور اسے انفرادیت کے قابل اعتراض اثرات سے بچانے کے لیے نماز باجماعت کی تلقین کرتا ہے۔ نفسیات کی مدد سے صرف عارضی ذہنی واردات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور مذہبی تجربے کی مدد سے خودی کا پتہ ملتا ہے، جو عارضی شے نہیں۔ تاہم ایسے تجربے میں اس خطرے کا امکان ضرور موجود ہوتا ہے کہ خودی کہیں اپنے ابتدائی مقامات کی لطف اندوزی میں کھو کر اگلے مقامات کے لیے سست رگ نہ ہو جائے۔ تصوف کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے اور اسی لیے شیخ احمد سرہندیؒ کو اپنی تحریک کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اقبال کے نزدیک مذہب کا آخری مقصد کچھ "دیکھنا" نہیں، بلکہ کچھ "ہونا" ہے، جس کے لیے سعیِ پیہم کی ضرورت ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ "میں ہوں" کی حقیقت "میں سوچتا ہوں" میں نہیں، جیسا کہ ڈیکارٹ کا خیال ہے بلکہ "میں ہو سکتا ہوں" یا "میں کر سکتا ہوں" کے یقینِ محکم میں ہے۔ خودی کا حصول کسی عقلی منزل کا حصول نہیں بلکہ ایک ایسے تجربے کا حصول ہے جس کا مقصد انسانی ممکنات کی آزمائش اور تکمیل اور جس کی غرض و غایت کائنات کی پیہم تعمیر و تجدید ہے۔ اسی میں خودی کے لیے بہت بڑی خوشی اور ایک بہت بڑے امتحان کا موقع ہے۔ خودی کی تربیت حالاتِ حاضرہ اور اپنے گرد و پیش سے روپوشی اختیار کرنے کی بجائے ان سے واقفیت اور ان پر قدرت حاصل کرنے سے ہوتی ہے۔

چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز
دل بغائب بندو با حاضر ستیز

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ایسی روحانیت انسانی خودی کے انکار کی بجائے اس کی توثیق کرتی ہے اور انسان کی خودی کی قوتوں کو مرتکز کر کے اور تہذیبِ نفس اور تنویرِ افکار سے اس کی اندرونی پراگندگی اور شر و لیدگی کو دور کر کے اسے ایک نئی شخصیت بخشتی ہے ایسی شخصیت جو اپنی ذہانت کو مکر و فریب کے لیے اور اپنی طاقت کو ہوسِ اقتدار کے لیے استعمال نہ کرے۔ ایسے روحانی تجربے کو جنون یا مجذوبیت کہہ کر اس

کی قدر و قیمت کو گرایا نہیں جا سکتا۔ اگر مادی زاویۂ نگاہ کے علاوہ اور بھی کوئی زاویۂ نگاہ ممکن ہے تو ہمیں اس کے امکان کی تحقیق کرنی چاہیے، خواہ اس میں ہمیں اپنے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کے معمول کو سرے سے بدلنا ہی کیوں نہ پڑے۔

اقبال کا خیال ہے کہ نفیِ خودی کی تعلیم بے یقینی اور تمام حیات سوز برائیوں کی ذمہ دار ہے۔ استحکامِ خودی کا مطلب حیات افروزی اور نفیِ خودی کا مطلب موت ہے خوف و یاس اور دوں ہمتی خودی کے لیے زہر قاتل ہیں۔ یورپ میں بھی نطشے نے عزم للقوۃ، شوق تسخیر اور بشر کو فوق البشر ہونے کی تعلیم دی تھی۔ نطشے کا فوق البشر جسمانی اور عقلی لحاظ سے تو کامل ہے مگر مذہب اور اخلاق کی ضرورت سے بے نیاز ہے۔ اس کے نظامِ زندگی میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن اقبال کا مردِ کامل خیر البشر ہے جو خدا کا قائل اور خدائی صفات سے متصف ہے۔ اقبال کے نزدیک موجودہ زمانے کے شدائد و مصائب کی وجہ بے مذہبی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کوئی عمومیت اور جمہوریت امن و عدل کی امین نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ اقبال کہتا ہے کہ شاید کوئی صاحب قلب و نظر، کوئی دانائے راز پیدا ہو جائے، جو دنیا کو موجودہ معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی بحران سے نکال کر کسی رفیع و جمیل منزل پر لے جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال کی یہ بشارت پوری ہو اور وہ حقیقتِ منتظر جس کے لیے انسان کی جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں کبھی لباسِ مجاز میں نظر آ جائے۔

(سید کرامت حسین جھنڈی)

تصورِ توحید

تمام مذاہب[1] میں خدا کا تصور کسی نہ کسی طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے صرف خدا کا تصور ہی نہیں دیا، اس تصور کو نکھار کر اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو بھی واضح کیا اور ایک اور صرف ایک خدا کو ملتِ اسلامیہ کی علمی، جذباتی، ثقافتی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بنایا۔ توحید کو جس خالص طریق پر اسلام نے پیش کیا ہے اس کی مثال دوسرے ادیان میں نہیں ملتی۔ ملتِ اسلامیہ اپنی کوتاہیوں کے باوجود ایک روحانی اور عرفانی بصیرت کی وارث ہے۔ یہ بصیرت توحید کو سمجھنے پر مشتمل ہے۔ اس صداقت پر عمل کرنا سب سے زیادہ مسلمان کا حق اور اس کا فرض ہے۔ اقبال اس توحید کو مؤمن کی اصل متاع سمجھتے ہیں اور اسی توحید کی وجہ سے مسلم قوم کسی دوسری قوم میں ضم نہیں ہو سکتی۔

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

اقبال موحد ہے۔ توحید میں وہ کسی قسم کے اشتراک کو گوارا نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والی وحدت وجود اور وحدت شہود کی بحثیں اس کے نزدیک فلسفیانہ ہیں۔ اسلام میں توحید کے مقابلے میں فقط شرک ہے علامہؒ کے نزدیک معتزلہ و اشاعرہ کی کلامی بحثیں اصل اسلام سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتیں۔ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

---

[1] استفادہ از اقبال اور احیائے دین، مولفہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۵۰

توحید علامہ کے نزدیک ایک جاننا، ایک ماننا اور ایک کا ہو رہنا ہے۔ علامہؒ کے نزدیک روحانی تزکیہ اور باطنی پاکیزگی، تعمیر شخصیت اور استحکام خودی توحید کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ انسانی شخصیت کے مثبت و منفی پہلوؤں کو کلمہ توحید پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ وہ اس توحید کے قائل ہیں جس سے قلب و دماغ اور ظاہر و باطن رنگا جائے اور صبغۃ اللہ شخصی اور اجتماعی وجود پر چھا جائے۔ وہ توحید کو سیدھا سادہ عقلی و جذباتی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس میں کسی الجھاؤ کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمز شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
طریق شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے

خدائے واحد کی ذات اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ گر ہے اور انسان کی یہ دوں ہمتی اور بدنصیبی ہے کہ وہ اسے پہچاننے کی بجائے اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہے۔ چاند، سورج اور دیگر مظاہر فطرت کی پرستش اور ایک خدا کی بجائے انسانوں کی خدائی کا اعتراف انسانی زندگی کی وہ کمزوریاں ہیں جن کے مظاہرے اس دنیا میں ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسان کی یہ کمزوریاں اس کی دوں ہمتی کی وجہ سے ہیں اور اپنی انہی کمزوریوں کے باعث وہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ خدائے واحد سے وابستگی کے نتیجے میں وہ کائنات پر حاوی نظر آتا۔

کل ساحل دریا پہ کہا مجھ سے خضرؑ نے
تو ڈھونڈ رہا ہے سم افرنگ کا تریاق

اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

علامہؒ کے نزدیک اسلام کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے لا الٰہ الا اللہ، اس کا ایک حصہ سلبی ہے اور دوسرا ایجابی۔ سلبی حصے پر مؤمن پوری کائنات میں الوہیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کائنات میں ایسی کوئی قوت نہیں جسے قبلۂ حاجات بنایا جا سکے اور جس کے قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنایا جا سکے۔ تمام کائنات میں ایسی کوئی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے، جس سے ڈرا جائے اور جس سے اپنی امیدیں وابستہ کی جائیں۔ اس نفی کے بعد وہ اس مثبت امر کی دعوت دیتا ہے جسے حقیقت خداوندی کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس ذات سے آگاہی کمال انسانیت ہے اور اس کے بغیر خود انسانی وجود اور اس کی حقیقت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا وجود کائنات اور خود انسان کی نورانیت کا باعث ہے، اور خدا کے انکار کو وہ نفی انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

علامہ مرحوم کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ مؤمن کی وجودی، اخلاقی و عملی اور فکری و عقلی بنیاد ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے ایجابی حصے سے مؤمن یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کائنات میں شان ربوبیت، خالقیت، رزاقیت، اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت خدا کے سوا کسی میں نہیں۔ علامہ مرحوم نے لا الٰہ الا اللہ پر مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

علامہ مرحوم کے خطبات میں تیسرا خطبہ تصورِ باری تعالیٰ اور اس کی فلسفیانہ تعبیر سے متعلق ہے۔ علامہ کے فکر و استدلال کا اندازہ ان بحثوں سے ہوتا ہے جو انہوں نے انا، خدا کی صفاتِ خلاقی، علیمی اور پھر اشاعرہ کے نظریات کے ضمن میں کی ہیں اور جن میں خالص فلسفیانہ انداز سے وجودِ باری اور ذاتِ باری پر بحث کی ہے۔ وہ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلامی عقیدۂ توحید کی فلسفیانہ توجیہ اور اس کی فلسفیانہ تاسیس ممکن ہے عقل کے لیے تسلی بخش ہو مگر دین محض فلسفے پر قناعت نہیں کر سکتا۔ انسانی روح حقیقتِ مطلقہ سے گہرا ربط چاہتی ہے اور یہ ربط استدلال سے نہیں بلکہ دعا سے پیدا ہوتا ہے جس سے روح میں نور اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ پھر وہ بڑی شرح و بسط کے ساتھ دعا کی حقیقت کو بیان فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تصور کو نظر انداز کر کے انسانی تکمیل ممکن نہیں اور خدا کے تصور میں توحید سے بہتر اور کوئی تصور نہیں۔ علامہ کا یہ عقیدہ ہے کہ توحید کے بغیر عظمت، شجاعت، ارتقاءِ شخصیت اور استحکامِ خودی کا حصول

ممکن نہیں۔ توحید ملتِ اسلامیہ کے استحکام کا سبب ہے اور خدا سے دوری مسلمانوں کی مقہوری و غلامی کا باعث۔ وہ بجا طور پر یہ اعلان کرتے ہیں۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

علامہ مرحوم نے عقیدۂ توحید کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے اور اسے ملت کی بیشتر بیماریوں کا علاج قرار دیا ہے۔ توحید خداوندی کے نور سے معمور سینے انسانیت کے لیے رحمت کا درجہ رکھتے ہیں۔ امتِ مسلمہ توحید کے ذریعے ہی مضبوط و مستحکم اور قائم و دائم رہ سکتی ہے۔

علامہ مرحوم مثنوی اسرار و رموز میں توحید کو ملتِ اسلامیہ کا رکنِ اساسی قرار دیتے ہیں اور اس پر بڑے دل نشیں انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

ملتِ بیضا تنِ و جاں لا الٰہ
ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما
رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

وہ وحدتِ امم کی دوسری بنیادوں پر تنقید کرتے ہوئے اپنی وحدت کی بنیاد توحید قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں۔

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل
با وطن وابستہ تقدیرِ امم
بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم

اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

ملت ما را اساس دیگر است
ایں اساس اندر دل ما مضمر است

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بند این و آں وارستہ ایم

آگے چل کر وہ ایک نیا عنوان قائم کرتے ہیں جس کے الفاظ ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہؒ کے ہاں توحید کی حقیقت کیا ہے۔

"در معنی این کہ یاس و حزن و خوف ام الخبائث است و قاطع حیات و توحید ازالۂ این امراض خیشہ می کند"

اس مقام پر وہ یاس و غم اور خوف و اندیشہ کو شرک اور شخصی تعمیر کے لیے مہلک قرار دیتے ہیں۔

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

ایں سبق صدیق را صدیق کرد
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

علامہ کے نزدیک توحید شخصی و ملی استحکام کا واحد ذریعہ ہے۔ خدا پر یقین

نہ ہونے سے بزدلی، لالچ، مصلحت کیشی اور غلط روی پیدا ہوتی ہے جب کہ توحید شجاعت، عظمت، عزم و استقلال اور بلند ہمتی پیدا کرتی ہے۔ حضرت علامہ نے بڑے حسین پیرائے میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ انداز بیان اتنا سہل اور روح پرور ہے کہ آدمی گنگناتا جاتا ہے اور قلب و روح کو اس سے جلا ملتی ہے علامہ کے منظوم کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو فلسفیانہ الجھاؤ سے بچا کر سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں دلوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نغمۂ توحید کو ہم گا کر پیش کرتے ہیں ہمارا ردیہ جیسا بھی ہو اس کی اثر آفرینی سے کوئی صاحب دل انکار نہیں کر سکتا۔

اور اسی جدید انداز سے وہ مشکل مسائل کو پیش کرتے ہیں اور یہی ان کا حقیقی کارنامہ ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان حقائق کے بیان میں شعری نغمہ و سحر کو تو اپنایا گیا ہے لیکن صحت حقیقت اور مطلوبہ صداقت کو مبالغہ آرائی سے ملوث نہیں ہونے دیا گیا۔ اسے آپ فن کا کمال کہہ لیں یا فراست مومنانہ مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ کہیں کوئی زائد لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

(ڈاکٹر خالد علوی)

تصوّرِ رسالت

علامہ مرحومؒ عشقِ رسالت میں اس قدر مست اور مستغرق نظر آتے ہیں۔ کہ انہیں ملی وجود کے لیے رسالت سے بہتر اور کوئی شے زیادہ وزنی نہیں محسوس ہوتی عقیدت و محبت کا یہ جذبہ بثبت تمدنی و دینی مصالح پر مبنی ہے وہ فرماتے ہیں[1]

حمد بے حد مر رسولِ پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است
نسخہ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان دخواجہ اوست

حضرت علامہ کو آنحضورؐ سے عاشقانہ تعلق ہے اس کی بنیاد پر وہ آپ کی شخصیت کو جس انداز میں متعارف کراتے ہیں دیکھیے اس میں کہری عقیدت و وابستگی کا

۱۔ استفادہ از اقبال اور سیاستِ دین" مولفہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۵۷

اظہار کتنا واضح ہے:

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تاجِ خسروی خوابید قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ او اشک بار اندر نماز
در دعائے نصرت آئین تیغ او
قاطع نسلِ سلاطینِ تیغ او
در جہاں آئین نو ایجاد کرد
مسند اقوام عالم در نورد
از کلیدِ دین در دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ ام گیتی نزاد
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست

علامہ مرحوم کے نزدیک نبی کریمؐ کی ذات انسانیت کی معراج ہے اور آپ کی ذات بابرکات سے مستقبل کی حاجات و ضروریات کی تکمیل کے لیے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ حیاتِ انسانی کے ارتقائی قافلے کے لیے حضورؐ کی شخصیت کو مکمل قائد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فطری اور عمرانی لحاظ سے حضورؐ کی قیادت کے بعد کسی نئی قیادت کی ضرورت نہیں۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

عجب کیا ہے مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

(ڈاکٹر خالد علوی)

تصورِ قرآن

علامہ[1] اقبال کی نظر میں قرآن کریم وہ کتاب ہے جو اللہ کے احکام اور اللہ کی حکمتوں پر مشتمل ہے۔

یہ قرآن اللہ کی وہ رحمت ہے جو ہر دور اور ہر جہان کے لیے ہے اسی طرح اس قرآن کے حامل نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ بھی دائمی رحمت ہیں اور ہر دور اور ہر جہان کے لیے ہیں۔ یہ ہے قرآن کے بارے میں علامہ اقبال کا اساسی اور بنیادی عقیدہ:

آن کتابِ زندہ قرانِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوان حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین

اگر قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اللہ ہی کے کلام پر مشتمل ہے تو ظاہر

---

[1] استفادہ از "اقبال شناسی اور محور"، مؤلفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۵۶ مقالہ نگار پروفیسر محمد منور۔

ہے کہ ہر فرد مومن جو کچھ سوچے گا قرآن کی روشنی میں سوچے گا اس لیے کہ دانائی اور حکمت کا اس سے بڑا اور اس سے زیادہ روشن اور اس سے زیادہ قابل اعتماد دوسرا کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہی حال اقبال کا ہے۔ "اسرار خودی" کے دور سے علامہ اقبال کچھ اور ہی ہو گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور
چشم تو بیندہ ما فی الصدور
خشک گرداں بادہ در انگور من
زہر زہر اندرمے کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا!

ایک سوال اہل فلسفہ و کلام کو خواہ وہ مسلمان تھے، خواہ غیر مسلم، ہر دور میں پریشان کرتا رہا کہ وہ وحی، جو آسمانی کتب میں مرقوم ہے آیا از روئے مفہوم و معنی وحی ہے، یا لفظاً بھی وحی ہے آیا مضمون ہی کسی پیغمبر کے دل میں ڈال دیا جاتا تھا یا مضمون کے ساتھ الفاظ بھی اُدھر ہی سے آتے تھے۔

ایک بار الیف سی کالج کے پرنسپل مسٹر ینگ (بڑے مسٹر ینگ) نے کسی دعوت و ضیافت کے موقع پر علامہ اقبال سے پوچھا تھا کہ آپ کے خیال میں قرآن کا صرف مفہوم آسمان سے اترا تھا یا الفاظ بھی؟ تو علامہ اقبال نے جواب دیا۔

"قرآن الفاظ سمیت اترا تھا"

ینگ بولے "حیرت کی بات ہے آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی یہ بات کہتا ہے"

اس پر علامہ اقبال نے یہ جواب دیا۔

"میں ایک ادنیٰ شاعر ہوں، مقام رسالت سے شاعری کو کیا نسبت ہے اس کے باوصف مجھ پر بارہا بنے بنائے شعر نازل ہوتے ہیں۔ اگر لفظوں سمیت مجھ پر شعروں کا الہام ہونے لگتا ہے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا الفاظ سمیت نازل ہونا کونسا ایسا بعید از قیاس امر ہے"۔

علامہ اقبال کا یہ یقین کہ قرآن کے الفاظ بھی اللہ ہی نے بھیجے اور وہ اللہ ہی کے کلمات ہیں انہیں اس اعتقاد سے مالا مال کرتا ہے کہ قرآن کے الفاظ اپنی ذات میں بھی نور اور شفا ہیں۔

تاریخ گواہ ہے اور کتب حدیث و رجال شاہد ہیں کہ عمر بن الخطاب کفر کے عالم میں اس نیت کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جا رہے تھے کہ جا کر آپؐ کا کام تمام کر دیں، مگر راستے میں انہیں بتایا گیا کہ وہ محمدؐ کے در پے ہونے سے قبل اپنے گھر کی خبر لیں، اس لیے کہ ان کی حقیقی ہمشیرہ اسلام قبول کر چکی ہیں۔ وہ ہمشیرہ سے نپٹنے کے لیے اس کے گھر گئے۔

"مگر وہاں ہمشیرہ کی زبان سے قرآن کے کلمات سن کر موم ہو گئے۔ ابھی کلمہ تو پڑھا نہ تھا قرآن کی حقانیت پر ایمان تو لائے نہ تھے، اس عقیدے کے ابھی مالک نہ ہوئے تھے کہ یہ کتاب، کتاب ہدایت ہے اور اس کے مطالب میں بے قیاس گہرائی اور گیرائی ہے، وہ تو الفاظ کے سوز ادا اور اسلوب بیان پر ہی مر مٹے اور پھر بے تابی کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جا کر گرے۔ عمرؓ جیسی مضبوط شخصیت، مگر دل زندہ سے سرمایہ دار شخصیت، قرآن کے الفاظ ہی سن کر مان گئی کہ یہ کوئی عام قسم کی کتاب نہیں، یہ کوئی اور ہی شے ہے۔

بہر حال علامہ اقبال دخترانِ ملت سے کہتے ہیں۔

ز شامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو!
دگرگوں کرد تقدیرِ عمر رضی اللہ عنہ را

رشید احمد صدیقی گنج ہائے گرانمایہ میں کہتے ہیں۔

"مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت اور آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے"

اس واقعے سے علامہ اقبال کے تعلق قرآن پر روشنی پڑتی ہے۔ کسی بزرگ سے یہی سوال کیا گیا کہ مطالعۂ قرآنِ ناظرہ، فہمِ مطالب کے بغیر بھی کوئی فائدہ دیتا ہے یا نہیں؟ تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ۔

"اگر آپ کوئی دوائی کھائیں جس کے اجزاء اور ان کے خواص کا علم آپ کو حاصل نہ ہو تو کیا وہ اثر نہیں کرتی"

دخترانِ ملت کو جو علامہ اقبال نے یہ کہا کہ۔

"بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را" اس کا یہی مقصد ہے۔

یہ واضح ہو چکنے کے بعد کہ علامہ اقبال کی نظر میں قرآن محض از روئے معنی ہی نہیں بلکہ از روئے لفظ بھی آسمانی اور الہامی کتاب ہے گویا جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو اس وقت اس کا براہِ راست اللہ کے ساتھ ایک رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ قرآن ایک ایسا رابطہ اور ایک ایسی رسی بن جاتا ہے، جس کے ایک جانب خدا ہو اور دوسری جانب بندہ اور اگر ساتھ ہی پڑھنے والے کو یہ خیال بھی رہے کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت جبریلؑ نے ادا کیے، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے، جن کو اسی طرح آئمہ صدیقین و شہدا و اولیاء نے ادا کیا، جن کو آج تک کروڑوں زبانیں اسی طرح پڑھ چکی ہیں، جس طرح میں ہیں پڑھ رہا ہوں، تو مطالعۂ قرآن کی لذت میں کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کتاب اللہ ہو حبل اللہ محدود من السماء الی الارض"

(اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے)

اسی مضمون کو علامہ اقبال نے الفاظ ذیل میں بیان کیا ہے۔ وہ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں۔

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ او ست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ او ست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

(ہم سرتاپا مٹی ہیں۔ دل آگاہِ قرآن ہے۔ یہ اللہ کی رسی ہے، اسے مضبوطی سے تھام لو اور اس رشتے میں اپنے آپ کو موتی کی طرح پرو لو، ورنہ ذرۂ خاک کی طرح آوارہ و پریشان ہو جاؤ گے)

(مرزا محمد منور)

تصورِ شریعت

مثنوی اسرار و رموز ایک عنوان باندھنے میں علامہ فرماتے ہیں :

"در معنی ایں کہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است"

حضرت[1] علامہ کے نزدیک شریعت کے بغیر تعمیر سیرت ممکن نہیں بلکہ فی الحقیقت سرِ اسلام ہی شریعت ہے۔ فرماتے ہیں :

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
با تو گویم سر اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع

ملّت اسلامیہ کی بقاء کا انحصار قرآنی احکام کی پابندی اور قرآن شناسی پر ہے۔ نبی اکرمؐ چونکہ اوّلین قرآن فہم و قرآن شناس ہیں اس لیے آپ کا اسوہ اور آپ کا طرزِ عمل شرع کا اہم جز ہے۔ علامہ کے نزدیک قرآن اور مصطفیٰ سے دوری ہلاکت و تباہی کا باعث ہے۔ فرماتے ہیں۔

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقاء از دست رفت

وہ شیخ احمد رفاعی رحمہ اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے امّتِ مسلمہ کو ایک ابدی اصول بتاتے ہیں، کہتے ہیں۔

---

[1] استفادہ "اقبال اور احیائے دین" مولفہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۷۴

با مریدے گفت اے جان پدر
از خیالات عجم باید حذر
قلب را زیں حرف لاگرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی

ان تین ثبت اصولوں کے ساتھ وہ دوسرے حقائق کو بھی بیان کرتے ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طور پر انہی تین ارکان سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے احیائے دین کا عظیم کارنامہ اپنے مخصوص اسلوب و طریق کار سے انجام دیا اور اس میں وہ کما حقہ کامیاب ہیں۔ انہوں نے امّتِ مسلمہ میں ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو دین کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ احیائے دین کا سارا کام اس احساس کے ساتھ کرتے ہیں کہ انہیں رسالتمآبؐ کی طرف سے حکم ہے ورنہ یہ قوم بڑی حق ناشناس ہے کہ صرف قطعات تاریخ وفات سننے کی خواہشمند ہے۔

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گو
بگوش مردہ پیغام جاں گو
ولے گویند ایں ناحق شناساں
کہ تاریخ وفات این و آں گو

چونکہ انہیں یہ فریضہ بزبان شعر انجام دینا ہے اس لیے وہ تاثیر طلب کرتے ہیں۔

خودی دادم ز خود نامحرمی را
کشادم در گلے او زمزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ از وے
بسوزم جز غم دیں ہر غمی را

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمان کے سامنے اسرار زندگی کھول دیئے

ہیں اور اس کو ماضی و مستقبل کے حقائق بھی سمجھا دیئے ہیں لیکن اس سارے طرزِ عمل میں نطق عرب کی ضرورت ہے جو صرف آنحضورؐ کی ذات سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ نطق اس لیے طلب کرتے ہیں کہ زیادہ بہتر طریق پر اثر انداز ہوں۔

بیرخشش وا نمودم زندگی را
کشودم نکتۂ فرداد دی را
تواں اسرار جاں را فاش ترگفت
بدہ نطق عرب ایں اعجمی را

حضرت علامہ نے زبان شعر سے احیائے دین کا فریضہ موثر طریق پر انجام دیا کیونکہ اس وقت غالباً اسی انداز کی ضرورت تھی۔

(ڈاکٹر خالد علوی)

تصورِ خلافت

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

علامہ اقبال خلافت کی بحالی کے طلب گار ہیں جب سے خلافتِ راشدہ کا نظام درہم برہم ہوا ہے۔ مسلمان برابر اس کوشش میں رہے ہیں کہ پھر وہ مثالی دورِ حکومت واپس آجائے جو دنیا میں امن و راحت کا پیغامبر اور خلقِ خدا کے لیے رافت و رحمت کی بارشیں برسانے والا سحابِ کرم تھا۔ اس کے لیے انہوں نے جان و مال کی ان گنت قربانیاں پیش کیں، گھر بار کو چھوڑ کر جلاوطنی کی مصیبتیں جھیلیں اور اپنی زندگی کو تلخیوں سے بھر لیا تاکہ یہ شہد و شکر سے شیریں چشمہ پھر ہاتھ آجائے اور ہم اس آبِ زلال سے اپنی پیاس بھی بجھائیں اور تمام کو سیراب بھی کریں ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

اسی کی تلاش میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کی سرزمین میں اپنا اور اپنے بہتر ساتھیوں کا سر بطور نذرانہ پیش کیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبل نے سفاک حکمرانوں کے کوڑے برداشت کیے۔ نفسِ زکیہ نے ہزاروں ساتھیوں سمیت جامِ شہادت نوش کیا۔ امام ابن تیمیہؒ نے جہاد کا معرکہ گرم کیا۔ مجدد الف ثانی نے تین سال گوالیار کے قلعے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں۔ شہدائے بالاکوٹؒ نے

لہ استفادہ "انداز بیان" مولفہ عبداللہ شاکر ص ۱۱۵

وطن مالوف سے ہزاروں میل دور غربت کدوں میں اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کر دیں اور ان کے ساتھیوں نے سو سال تک انگریز کے خلاف معرکہ جہاد گرم رکھا خود مسلمانانِ ہند نے بھی اسی دریکتا کی بازیابی کے لیے تحریکِ پاکستان کے ذریعے ہندو اور انگریز سے چومکھی لڑائی لڑ کر خطۂ پاکستان حاصل کیا۔

پاکستان میں آنے کے بعد ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفےٰؐ کا محرک بھی یہی جذبہ صادق تھا جس نے پھر مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی دیوار بنا دیا اور حکمرانوں کو ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ اس دارِ خلافت میں کیا خصوصیات تھیں جن کی بازیابی کے لیے علامہ اقبالؒ بے چین نظر آتے ہیں اور مسلمانوں سے اسلاف کا قلب و جگر ڈھونڈھ لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

جب ہم حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں تو ہمیں خلافتِ راشدہ میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

(۱) زمین اللہ کی ہے اور خلیفہ اس کا امین ہے۔ امین کا کام اللہ کی مرضی سے اس میں تصرف کرنا ہے، اپنی خواہشات بروئے کار لانا نہیں۔

(۲) یہ نظام ایک شورائی نظام ہے اور اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ خلیفہ یا اس کے نائبین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی مرضی عوام پر مسلط کریں، بلکہ قرآن کے ارشاد کے تحت تمام مسلمان خلافت میں شریک ہیں اور اس میں ہر ایک کی صائب رائے کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

(۳) آزادی و حریت اور رائے کا اظہار ہر انسان کو حاصل ہے، حتیٰ کہ ایک بڑھیا بھی خلیفہ کا دامن کھینچ سکتی ہے اور ایک بدو بھی خلیفہ سے سرِ محفل پوچھ سکتا ہے کہ "یہ چادر تم نے کہاں سے حاصل کی؟"

(۴) خزانے میں تصرف اپنی مرضی سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے اصحابِ شوریٰ

کی رائے درکار ہے۔ یہاں تک کہ بیمار خلیفہ بھی اپنی دوا کے لیے شہد لوگوں سے پوچھ کر استعمال کرتا ہے۔

(۵) عدلیہ آزاد ہوتی ہے اور قانون سے کوئی ہستی بالاتر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خلیفہ کے دامن پر بھی دھبہ ہے تو اسے عدالت ہی صاف کر سکتی ہے۔

(۶) دورِ خلافت میں مساوات ہے۔ شہری حقوق میں سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔

(۷) ترقی کے مواقع سب کے لیے ہیں۔ مخصوص طبقات کی اس نظام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اجارہ داریاں نہیں ہیں۔

(۸) ہر کام کرنے سے پہلے اللہ اور اس کے رسولؐ سے پوچھنا پڑتا ہے کہ یہ کام کریں یا نہ کریں؛ اگر کرنے کی اجازت ہو تو کیا جا سکتا ہے ورنہ خواہشات کے گھوڑے کی باگیں پیچھے کھینچنا پڑتی ہیں۔

خلافتِ راشدہ کے یہ بڑے بڑے اصول ہیں جن کی بناء پر مسلمان اس کی بحالی کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ میں اس نظام کی جو خوبیاں بیان کی ہیں اسی کی گفتگو علامہ اقبالؒ کے آئینۂ اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ؎

الحذر آئینِ پیغمبر سے ہو یارا الحذر
حافظِ ناموسِ زن ہر دو آزما مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اور آخر میں اپنے مشیروں کو ہدایت کرتا ہے کہ ؎

مست رکھوں ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دوں مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس نظام کا بنیادی پتھر توحید ہے۔ توحید ہی وہ سوتا ہے جس سے زندگی کی تمام رگیں سیراب ہوتی ہیں اور ان میں خونِ صالح دوڑ سکتا ہے۔ خدا کو قادر و قیوم مان کر اپنی تمام خواہشات سے دستبردار ہو جانے کا نام توحید ہے خدا کو واحد دیکتا تسلیم کرنے سے یہ بات خود بخود مسلّم ہو جاتی ہے کہ قانون ساز بھی وہی ہے اور فی الحقیقت قانون سازی اور بادشاہی زیبا بھی اسی کو ہے، کیونکہ اس کی بادشاہی ازل سے ہے اب تک رہے گی اور اس کی ذات تمام جہاں سے بے نیاز ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

گویا اگر توحید کی ضو سے ظلمتِ کردار روشن نہ ہو تو مسلمان خود اپنے مقام کو بھی نہیں پہچان سکتا ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

وحدتِ الٰہی سے وحدتِ قوم جنم لیتی ہے۔ عربی اور عجمی، کالے اور گورے کی تمیز مٹتی ہے۔ لونی، لسانی تفرقے دور ہوتے ہیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس وحدتِ الٰہ کی برکت سے بتانِ شعوب و قبائل کو توڑا اور نسلی تفاخر کی جڑوں پر تیشہ چلایا جاتا ہے۔ شاعرِ مشرق نے مسلمان کو اسی کی نصیحت کی ہے ؎

بتانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، یہ تُورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ چمن! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

توحید کے بعد عشقِ رسول کی قندیل ہے جس سے ارض و سما کی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں اور ظلمت کدۂ دہر میں اجالا ہو سکتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

"رسول جو شے تمہیں عطا کرے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ"

عشقِ رسولؐ ہی مسلمان کی زندگی کا مرکز اور محور ہے اور اسی کے گرد تمام اطاعتیں اور وفاداریاں گھومنی چاہئیں اسی ذات کو قبلۂ مقصود بنا کر نمازِ عشق ادا ہوتی ہے اور اسی نماز کی برکت سے دونوں جہاں کی بادشاہی مسلمان کے قدموں میں ڈال دی جاتی ہے ؎

لوح بھی تُو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

عشقِ رسولؐ کی ضو سے جب سینے منور ہو جائیں تو خود بخود جہالت کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور دشمنیاں دوستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۳-۱)

ترجمہ: اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا چھوڑ دو

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے۔ "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور تنازع برپا نہ کرو ورنہ تم سُست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"

گویا اتفاق و اتحاد ہی وحدتِ ملّی کا ذریعہ ہے اسی سے مسلمانوں کی دھاک اعدائے دین پر بیٹھ سکتی ہے۔ اس لیے حضورؐ نے مسلمانوں کو دیوار کی اینٹوں سے تشبیہ دی ہے جو ایک دوسری کی مضبوطی کا سبب بنتی ہیں حکیم الامت کا ارشاد ملاحظہ ہو ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اور ساتھ ہی ہدایت کی ؎

ملّت کے ساتھ ربطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

خلافتِ راشدہ کی بازیابی جس نظریے کی مرہونِ منت ہے وہ آفاقی نظریہ اسلام کو برپا کرنا ہے جس کی رو سے تمام کائنات کا بادشاہ اللہ ہے اور مسلمان اس کا خلیفہ ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام کائنات مردِ مومن کی میراث ہے۔

یہی وہ نظریہ تھا جس نے ایک پس ماندہ قوم کو اٹھا کر آفاق کی وسعتوں میں

پھیلا دیا۔ اونٹوں کے چرواہوں اور صحرا کے بدوؤں کو دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا دیا۔ صحرا، پہاڑ اور دریا ان کے راستے سے ہٹ گئے اور وہ آندھی کی طرح چھاتے اور صبا کی طرح پھول کھلاتے چلے گئے ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

انہوں نے قرآن کو سینوں سے لگا کر صفحۂ دہر سے باطل کو مٹا دیا اور ساری دنیا میں خدا کی بادشاہی اور محمدؐ کی رسالت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اب بھی اگر خلافت قائم ہو سکتی ہے تو انہی صفات سے متصف لوگوں کا اتباع کرنے سے ہو سکتی ہے اور انہیں نظریات کو حرزِ جاں بنا کر ہو سکتی ہے جن پر ہمارے اسلاف کاربند تھے اور جن کی دعوت ہمیں قرآن چودہ سو برس سے پکار پکار کر دے رہا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(عبداللہ شاکر)

تصوّرِ امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(اقبال)

تصوّرِ مملکت

علامہ اقبال کا تصورِ تہذیب و قومیت ان کے کلامِ نثر و نظم میں بہت واضح ہے وہ اپنا ہر تصور قرآن و سنت سے اخذ کرتے ہیں اور جادہ اسلام سے سرمو ڑنے کو کبھی تیار نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے مندرجہ ذیل ارشادات میں اپنے مفہوم کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس کے حل پر اس امر کا دار و مدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تمثیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظاموں کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ میں نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا۔ جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی کرتے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمان ہندوستان کے سامنے ہے۔"

مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیہ کے تحت اس ملک میں مسلمانوں کو آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

میری خواہش ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست

میں ملا دیا جائے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی ہی پڑے گی۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدّنی قوّت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیّت قائم کرے۔"

"اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظامِ قانون کو عملی طور پر نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ اور اس کی توسیع کا کام مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ کئی سال سے میرا یہ ایقان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل اور پُرامن ہندوستان کے حصول کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں تو دوسری صورت صرف طویل خانہ جنگی ہے۔" (خطباتِ اقبالؒ)

"مسلم ہندوستان کے لیے ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے بڑی مسلم اکثریت کے لیے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی قرارداد ضروری ہے کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آگیا ہے۔ جواہر لال کی اشتراکیت کا شاید یہی بہتر جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں۔"

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ پیش کرتا ہوں۔"

"ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ وہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی ہستی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیّل سے متاثر ہوں تو آپ کی پراگندہ قوتیں از سرِ نو مجتمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

یہ اقتباسات علامہ کے خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ الٰہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء اور اقبال اور ریاست میں سے لئے گئے ہیں اور آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مفکر و مصوّرِ پاکستان نے پاکستان کا تخیّلی نام لیے بغیر کن حیرت انگیز خطوط پر پیش کیا ہے وہ اپنا خطبہ ان الفاظ

پر ختم کرتے ہیں۔ علیحدہ اسلامی ریاست کی ضرورت کیوں ہے؟ اور مسلمانوں کو کیا کرنا ہے۔ اور اسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کا جواب علامہؒ کے نزدیک صرف اسلام اور جدد اور یہی پاکستان کا حقیقی تصور ہے۔ جس کے تعیّن کی اب نئے سرے سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ملّتِ بیضا پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک لیکچر دیتے ہوئے علامہؒ نے اپنے نقطۂ نظر کی اس طرح وضاحت کی۔

"اسلام کی نوعیّت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھکر ہے۔ اسلام میں قومیّت کا مفہوم بھی خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصوّر اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں بالفاظِ دیگر اسلامی تصوّر ہمارا وہ ابدی گھر اور وطن ہے کہ جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام مسلمانوں سے ہے۔ جیسے ہی اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔"

"ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیّت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں۔ جو بوجہ کسی اکتسابی یا اتحادی مرکز نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا۔ اور گرد و پیش کی قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی نسبت زیادہ قوّت و جان ہوگی۔"

پھر ایک دوسرے موقعہ پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے فروری ۱۹۳۳ء کے دہلی کے اجلاس میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیّت کرتا ہے۔ کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں میں صرف کر دے اس دینِ قیم کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔

جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں جن میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔

گویا شمال مغربی سرحدی علاقے میں جس اسلامی مملکت کا خواب علامہ قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے یہ اس کا نقشہ اور نظام تھا جو ان کے ذہن میں محفوظ تھا اور یہی اس مملکت کا حقیقی تصوّر تھا جو ۱۵ سال بعد دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے ابھرنے والی تھی۔

(ماخوذ از چراغ راہ۔ کراچی)

(سید اسعد گیلانی)

تصوّر نظریاتی مملکت

اقبالؒ نے اپنی ملت کو ایک مقصدِ زندگی کی طرف دعوت دی ہے۔ ان کی شاعری محض تفریحِ طبع یا اظہارِ فن کا ذریعہ نہیں ہے اور نہ ہی اعلیٰ تر شعری روایات میں کسی بیش بہا اضافے کے جذبے نے انہیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا ہے۔ شعر گوئی ان کے لیے اپنی دعوت کو موثر ترین انداز میں پیش کرنے کا خوبصورت پیرہن ہے۔ درحقیقت اقبالؒ اس دور میں تجدید و احیاءِ دین کی جدوجہد کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دینِ اسلام کو از سرِ نو نظامِ زندگی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ انہیں اس کام کے لیے بازوئے حیدر کی تلاش ہے فقرِ بوذر کی ضرورت ہے اور ایک ایسے مردِ مومن کی جستجو ہے جو اس عظیم کام کا بیڑا اٹھائے۔ وہ اپنی ملت کو جگانے کے لیے حدی خوانی کا کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی امید رکھتے ہیں کہ یہ ملت ایک ایسا رہنما ضرور پیدا کرے گی جو اسے اپنے ساتھ لے کر دین کو اس دورِ حاضر میں برپا کرنے کی منزلِ وحید کی طرف پیش قدمی کرے گا۔

اقبالؒ دینِ اسلام کو ایک نظامِ حیات سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے جسے نافذ کرنے کے لیے ایک آزاد معاشرے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایک علیحدہ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایک نظریاتی اقتدارِ اعلیٰ اور ایک ہیئتِ حاکمہ کی ضرورت ہے۔ ان چاروں عناصر کے حصول سے ہی اقبالؒ کی یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے کہ اس کا مطلوبہ نظام خطے میں جاری اور نافذ ہو

لہ استفادہ از "اقبال و دارالاسلام" مودودی از سید اسعد گیلانی ص ۴۲

اقبال کا نظریاتی نظام اسلام ہے اس کی مثالی ہیئت حاکمہ خلافتِ راشدہ ہے اس کے آئیڈیل ہیرو خلفائے راشدین ہیں۔ اور وہ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں ہے جہاں خلافتِ راشدہ کی طرز پر ایک ایسا روحانی اور سیاسی نظام جاری ہو سکے جسے چلانے والے ہاتھ بازوئے حیدری کی مانند اور جس کی خدمت کرنے والے "مخدوم حاکم" عمرِ فاروقؓ کی طرح ہوں۔ وہ اپنی تخیلی نظریاتی مملکت میں "خادم حاکم" کا تصور رکھتا ہے جس کے اہل بیت چکی چلا کر اپنا آٹا پیستے اور ساتھ ساتھ تلاوتِ قرآن پاک کرتے ہیں اور حاجتمندوں کی فریاد بلند ہونے سے پہلے خود اپنے کندھوں پر ان کی ضروریات لاد کر ان کے گھروں تک پہنچاتے ہیں۔ اقبالؒ اپنے تصورات میں یہی خوش آئند خواب دیکھتا ہے اس لیے کہ اقبالؒ کے ہاں روح اور مادے کی تقسیم موجود نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا روح پرور اور عدل اجتماعی پر مبنی نظام وجود میں آتا ہے۔

اقبالؒ نے کہا۔

"اسلام وحدتِ انسانی کو روح اور مادے کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔"[1]

اقبالؒ قوم پرستی پر مبنی ریاستوں کا مخالف ہے۔ وہ قومیت پرستی کے تصور میں خدا کے مقابلے میں ایک جانبدار اور بے رحم الوہیت اور فتنہ و فساد کا منظر دیکھتا ہے چنانچہ قوم پرستانہ تہذیب کے بارے میں اس کی پیشین گوئی یہ ہے کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

---

[1] اقتباس از خطبہ اجلاس آلہ آباد مسلم لیگ ۱۹۳۰ء

اس لیے اقبالؒ کی نظریاتی قومیت، اخلاقی نصب العین اور اصولی موقف رکھتی ہے وہ نسل، زبان، خطے، رنگ یا قبیلے میں قومیت تلاش نہیں کرتا، نظریے کے اندر اصولِ اجتماعیت تلاش کرتا ہے اور چونکہ پوری بنی نوع انسان کے پاس ایک نظریاتی نصب العین جو اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے صرف اسلام ہی ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے بین الاقوامی کردار کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے اسے اسلام کے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

"اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے"۔[1]

آگے چل کر انہوں نے کہا۔

"اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہو"۔[2]

اقبالؒ اپنے مطالعہ کی بناء پر یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بقاء کا راز اسلامی نصب العین میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد سے دست بردار ہو گئے تو وہ تاریخی قوتوں کے ریلے میں بہہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جانے سے انہیں کوئی چیز بھی نہیں بچا سکے گی۔

---

[1] اقتباس از "خطبہ اجلاس الہ آباد مسلم لیگ" دسمبر ۱۹۳۰ء

انہوں نے اپنے خطبے میں کہا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔"[1]

اقبالؒ کے نزدیک مملکت کا وجود اس کے بھی لازمی تھا کہ فرد کی اصلاح کا مؤثر ترین ذریعہ مملکت ہی ہو سکتی ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے جو تدابیر بھی پیشِ نظر ہوں ان میں مملکت کے کردار کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ اسلام اپنے وجود کے اندر ہی ریاست اور اجتماعیت کا تصور رکھتا ہے وہ اپنے بے شمار احکام ریاستی اور اجتماعی زندگی سے متعلق رکھتا ہے۔ اگر کسی خطہ زمین میں مسلمان آبادی کو ریاستی سطح پر اختیارات حاصل نہ ہوں تو ان کا دین اپنے کامل ظہور سے محروم اور اپنی تمام برکات کے منکشف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

انسانی معاشرہ محض ایک ایسی اکائی نہیں ہے جیسے سکے کا ایک رخ ہوتا ہے۔ معاشرے کے بے شمار اجتماعی حقوق، فرائض اور ادارات ہوتے ہیں۔ تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی۔ ان میں اگر ہم آہنگی اور توافق نہ ہو تو سارا معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر اس کے مختلف ادارے مختلف نظریات کی آماجگاہ بلکہ تجربہ گاہ بنے ہوئے ہوں تو پھر اس معاشرے انتشار خانہ جنگی اور خانہ ویرانی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا

---

[1] اقتباس از "خطبہ اجلاس مسلم لیگ الہ آباد، دسمبر ۱۹۳۰ء

نظامِ مملکت موجود ہو جو معاشرے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو اور اسلام کے سوا یہ خوبی کسی نظام میں بھی نہیں ہے۔ اسلام جس قدر زندگی کے مختلف گوشوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی قدر اس کی ہم آہنگی یک رنگی نیز گوناگوں بوقلمونی انسانی زندگی کو برکات و حسنات سے معمور کر دیتی ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک اسلام کو اپنی مکمل جلوہ آرائی کے لیے آزاد مملکت کی اشد ضرورت ہے اور مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کامل دینِ اسلام کو مکمل طور پر نافذ کرے۔ ظاہر ہے کہ نفاذِ اسلام ایک آزاد مملکت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جب ایک ایسی مملکت وجود میں آ جائے تو پھر اسے قائم رکھنا اور نظریاتی سطح پر فلاحِ انسانیت کے لیے اس مملکت کو استعمال کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اگر ایسی مملکت وجود نہ رکھتی ہو اور مسلمان مملکتِ غیر یعنی باطل نظام میں رہتا ہو تو پھر جہادِ زندگانی کے ذریعے اس مملکت کو وجود میں لانے کے لیے مسلسل اور پیہم جد و جہد کرنا یہ اس کی زندگی کا مستقل مشن ہے۔ جس طرح پانی کے بغیر مچھلی کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح اسلامی مملکت کی شہریت کے علاوہ کسی باطل مملکت کی شہریت کا تصور بھی اسلامی ضمیر کے لیے خوش گوار نہیں ہے۔ غرض مسلمان کا جہادِ زندگانی ہمیشہ جاری رہتا ہے یا دوامِ مملکتِ اسلامی کے لیے یا قیامِ مملکتِ اسلامی کے لیے۔ اس کے سوا دیگر سارے مقاصد اس عظیم مقصد کے تابع ہیں۔

مومن کے اس کردار کے دونوں رُخ اقبالؒ نے بیان کیے ہیں۔ جب مملکتِ اسلامی موجود ہو اور مومن اس کا شہری ہو تو مومن کا کردار ریشم کی مانند اور جب باطل کا نظام غالب ہو اور اس سے جہادِ زندگانی جاری ہو تو مومن کا کردار فولاد کی مانند ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی وہ شبنم کی ٹھنڈک اور کبھی وہ طوفان کی دھمک ہوتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو ریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پھر فرمایا،

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبالؒ جس مملکت کا خواب دیکھتا ہے وہ مساواتِ انسانی کا مثالی نمونہ ہے۔

"اسلام، اب بھی ایک ایسی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جہاں انسان کا معاشرتی درجہ، اس کی ذات، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے منافع کی مقدار سے معین نہ ہوتا ہو، بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غریب مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی معدودوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر ہو۔ جہاں ایک عام فرد ایک صدر مملکت کی لڑکی سے بھی شادی کر سکتا ہو۔ جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی حیثیت رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کرے۔"[1]

یہ اقبالؒ کا آئیڈیل اسلامی اسٹیٹ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے ایک قومیت کا وجود بھی دورِ حاضر میں لازم شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے علامہ نے اسی خطبے میں فرمایا۔

"اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی تصور ہمارا

[1] اقتباس از خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء

وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہی اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔"[1]

پھر اس نظریاتی اور اصولی مملکت کے علمبردار کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

"جماعتِ اسلامی کا زندہ رکن بننے کے لیے انسان کو مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہیے۔ صبغۃ اللہ کے اس پیمانے میں رنگنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان دو رنگی چھوڑ کر یکرنگ ہو جائیں۔"[2]

علامہ اقبالؒ مملکت کے بغیر اسلام کا تصور بھی ادھورا سمجھتے ہیں۔ فرمایا:

"سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے اور سیاسیات میں میری دلچسپی بھی اسی وجہ سے ہے۔ میری یورپ کی وطنیت کی مخالفت بھی اس بنا پر ہے کہ اس کے اندر روزانہ مادیت پرستی کے بیج ہیں جو میرے نزدیک انسانیت کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے۔"

علامہ کے نزدیک اسلام میں سیاست کی اساس اخلاقیات پر ہے اور وحی والہام کی ہدایات اس کے لیے رہنمائی کا مقام رکھتی ہیں۔ اسلام کا سیاسی نظام عالمگیر اصولوں پر مبنی ہے، اور پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کا پروگرام اپنے

[1] [2] اقتباس از خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور، ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء

پاس رکھتا ہے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے مسلم زعماء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام کے پیشِ نظر ایک ایسا عالمگیر نظامِ سیاست ہے جس میں اساس وحی اور تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے وہ عہدِ جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں۔"[1]

اسلامی مملکت کے بارے میں اقبالؒ کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے بین الانسانی اور بین الاقوامی ہے۔ اس میں رنگ و نسل اور علاقہ و جغرافیہ کی محدودیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

"عالمِ اسلامی کا ظہور ہوگا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق و تطابق سے بدل دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمنِ اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم بھی کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔"[2]

اسلامی مملکت نظریۂ وطنیت کی مرہونِ منت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنے وجود کی تقویت کے لیے وطنیت، نسلیت یا لسانیت کا سہارا لیتی ہے۔ وہ نظریاتی اور اصولی مملکت ہے اور اس کی حب الوطنی ایک نظریاتی فعل ایک طبعی جذبہ اور ایک شعوری عمل ہے اس میں اندھی عصبیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

---

[1] اقتباس از خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء

[2] تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، پانچواں خطبہ

علامہ نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"حب وطنی بالکل ایک طبعی صفت ہے جس کو انسان کی اخلاقی زندگی سے محذوف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اصل اہمیت ایمان، تہذیب اور روایات کو حاصل ہے یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان کے لیے زندہ رہے اور انہیں کے لیے مرے نہ کہ زمین کے اس ٹکڑے کے لیے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی سا ربط پیدا ہو گیا ہے۔"[1]

علامہ اقبالؒ کے سامنے اسلامی ریاست کی نوعیت اور خصوصیات کی بھی پوری تصویر موجود تھی۔ انہیں اس امر میں ذرا بھی الجھاؤ نہیں تھا کہ اسلامی مملکت کس نوعیت کی ہوگی وہ یورپ کی ایجاد کردہ کسی طرزِ حکمرانی سے بھی مرعوب نہ تھے اور نہ قومیت سازی کے جدید تصورات نے ان پر کسی درجے میں اثر کیا تھا۔ ان کا تصورِ اسلامی ریاست کے بارے میں نہایت درجہ صاف اور واضح تھا۔

انہوں نے اپنی وفات سے صرف چار ماہ پہلے ایک پیغام دیتے ہوئے فرمایا۔

"جب[2] تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا اور جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات محو نہ ہو جائیں گے اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور نہ اخوت و حریت و مساوات

---

[1] آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء میں خطبۂ صدارت

[2] سالِ نو کا پیغام، یکم جولائی ۱۹۳۸ء آل انڈیا ریڈیو

کے عظیم الفاظ شرمندہ معنی ہوں گے۔"

ایک موقعہ پر انہوں نے اسلامی مملکت کے فرائض کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"حکومت کا تو سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اخلاق کی حفاظت کرے لیکن آج کل کی حکومتیں تو صرف لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات کی نگرانی اور احتساب کا کام ہی کرتی ہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ پر یہ بات بہت اچھی طرح واضح تھی کہ اسلام ایک نظامِ مملکت ہے اور ایک مملکت کے وجود کے بغیر اسلام کا عملی تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔

(سید اسعد گیلانی)

[1] مکتوب بنام خواجہ عبدالرحیم

تصورِ تجدیدِ ملّت

عصرِ حاضر کے چیلنج کی زد پر آنے کے اسلام کے متعلق یہ اہم سوال اقبال کے ذہن میں ابھرا کہ آیا اسلام جو ایک بار اپنے عظیم الشان ثمرات دے چکا ہے اور افراد اور معاشروں کو معراجِ کمال تک پہنچانے کا تجربہ پیش کر چکا ہے تاریخ کی بساط ڈور از سرِ نو ہاتھ میں لے کر جادۂ ارتقائے انسانیت کی دوبارہ رہنمائی کر سکتا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے کہ فلسفۂ تاریخ کے دائرے میں جا داخل ہوتا ہے۔ اقبال کے دور میں یہ تصورِ تاریخ نمودار ہو چکا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر قوم ایک جسم نامیہ کی طرح بچپن، شباب اور پیری کے طبعی ادوار سے گزر کر اموات سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور اس کا تمدن ایک مرتبہ ختم ہونے کے بعد پھر ظہور نہیں پا سکتا۔

نہ ڈھونڈ اہلِ دل کو اب کہ جوشِ فلزمِ فنا
متاعِ دردِ جن میں تھی، وہ کشتیاں ڈبو چکا

اقبال کے ایمان نے اس تصورِ تاریخ کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اس نے اس تصورِ تاریخ پر سخت تنقید کی ہے۔ اقبال کی نگاہ میں تاریخ حق و باطل، خیر و شر یا کفر و دین نام کی دو قوتوں کی روداد کش مکش ہے۔ اور ازل سے امروز تک چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی سے ستیزہ کار چلا آ رہا ہے اقبال کی نگاہ میں وہ ایک ہی داستان ہے جس کی ابتدا اسمٰعیل علیہ السلام اور انتہا امام حسینؓ پر ہوتی

[1] استفادہ از اقبال اور نظریہ پاکستان مؤلفہ نعیم صدیقی ص ۶۴

ہے قرآن کا فلسفۂ تاریخ اس کے اندر روحِ احیاء یا تجدیدیت (RENIURLISM) کو کارفرما دیکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے تمدّن نامیاتی جسم نہیں ہوتا بلکہ ایک تحریک ہوتا اور یہ تحریک محض خارجی قوتوں اور قوانین کے رحم و کرم پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے انسانی ارادہ اور فیصلہ کارفرما ہوتا ہے ؎

فصلِ گل از نشترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است
دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است

ہم چناں از فردہائے پے بپے ہست تقویم امم پائندہ تر

اقبال اپنا ایک مستقل فلسفۂ تاریخ رکھتا ہے اور اس کی تفصیلات خاصے بڑے پیمانے پر اس کے ہاں واضح کی گئی ہیں۔ یہ فلسفۂ تاریخ کے ان تمام نظریات سے ہر نکتہ پر متصادم ہوتا ہے جو جدید مادی تہذیب نے پیش کئے ہیں خواہ وہ سرمایہ داری کی فضا میں پلے ہوں یا اشتراکی ماحول میں وہ انبیاء کو تاریخ کی زمام تھامنے والا اور بار بار ایک ہی حقیقت کے چراغ روشن کرنے والا مانتا ہے۔ کاشت کار نہ ہو تو بھی پودے اُگتے ہیں۔ بیج چھوڑ جاتے ہیں اور ان سے پھر نئی روئیدگی جاری رہتی ہے لیکن کاشت کار کا شعور و ارادہ اور اس کی محنت و کارکردگی فطرت کے عمل کو تیز تر اور منظم کر دیتی ہے اور اسے اپنے مفاد و ضروریات کے رُخ پر ڈال دیتی ہے۔ اسی طرح تاریخ کی تشکیل صرف احوال و ظروف، فطری ذرائع و رسائل، اس کے نوامیس و عوامل کے ہونے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ "انسانی ارادہ" جب ان میں دخیل ہوتا ہے اور صلاحیت در افراد قیادت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر بھرپور کام کرتے ہیں تو تاریخ کی ایک رفتار بنتی ہے، اس کی سمتِ سفر معیّن ہوتی ہے اور معاشرہ کسی متعین نصب العین کی طرف بڑھتا ہے ——— بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ انسانی ارادہ کے فعال ہونے

پر ہی تاریخ وجود میں آتی ہے، ورنہ حیات تک محض بکھرے ہوئے بے شعور اور بے مقصد افراد پائے جاتے ہیں سوائے متفرق حوادث کے کچھ موجود نہیں ہوتا۔

ایک اور چیز اقبال کے فلسفۂ تاریخ میں تجدیدیت بھی پائی جاتی ہے، یعنی تاریک ادوار کے بعد بار بار طلوعِ سحر کا ہونا اور خزاں کے عمل کے بعد بار بار موسم گل آنا ؎

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!

مغرب کے نظریات اور نظاموں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بعد اقبال کے سامنے یاس کی جو تاریکی آگئی تھی اس سے اگر کسی چیز نے اس کو بچا نکالا تو وہ اسلام کا نظامِ زندگی تھا جس کی شاخیں ہر پت جھڑ کے بعد نئے دورِ بہار کا آغاز کرنے کے لیے اپنے دامن میں احیاء کے بیج رکھتی تھیں۔ اس تصورِ احیاء کو اس نے قوم کے سامنے آبِ حیات کی حیثیت سے رکھا۔

اقبال اسلام کی اسی قوتِ احیاء (REVIVING FORCE) کی وجہ سے ناسازگار ترین حالات میں بھی پرامید رہا ہے ؎

پھر ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
یا جیسے کہ وہ ابلیس کی زبان سے کہلواتا ہے کہ ؎
مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

وہ تاریخ میں ملّت اسلامیہ کے لیے نت نیا جنم لینے REBIRTH کا قائل ہے اور یہ فخریہ کہتا ہے کہ بار بار نئے مقاصد ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں اور ہم زمانے میں آگے بڑھتے ہوئے بار بار مرتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسلام کو ایک "ملت ساز" اور "قوم FORCEP EOPLE BUIDING کا عنوان دیتا ہے۔

تحقیق و تفکر کے ان مراحل کو طے کرنے کے بعد اقبال کو ہندوستانی مسلمانوں کے دردِ بے درماں کا مداوا ہاتھ آگیا اور نظریہ اسلامی اس لحاظ سے بھی اس کا مرکزِ امید بن گیا کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کا سفینہ ہلاکت انگیز سیاسی

طوفانوں سے بچ کر نکل سکتا ہے تو صرف اسی نظریۂ حق کے سہارے!

ہندوستان میں آٹھ سو سال تک فرماں روائی کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو اسلام سے انحراف اور ادائے فرض میں کوتاہی کرنے کی سزا ملی اور وہ بادشاہت کے بام بلند سے گر کر غلامی کے گڑھے میں آ پڑے تو ان کی ایک ایک چوٹ سے اٹھنے والی درد کی لہروں نے انہیں احساس زیاں دلایا۔ مگر اب ان کے سروں پر بیرونی اقتدار کی سنگینیں تنی تھیں اور ذلت و محکومی کے دوزخ سے نکلنے کے تمام دروازے ان پر بند تھے پھر انہوں نے دیکھا کہ بیرونی اقتدار نے ان کی سابق محکوم قوم۔ ہندوؤں کو — ایک مضبوط حریف کی حیثیت سے ان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ہندوؤں کے لیے تعلیم، معاشی ترقی اور جاہ و منصب کے دروازے عین اس مرحلے میں کھلنے لگے جب کہ مسلمانوں سے ان کے سابق عروج کے جرم کا انتقام لیا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمان دو دشمن طاقتوں کے درمیان اس طرح گھر گئے جیسے گیہوں چکی کے دو گھومتے پاٹوں سے گذر رہا ہو۔ گویا تعمیر نو اور داخلی اصلاح و ترقی اور گم شدہ عروج کو حاصل کرنے میں دو ایسی قوتیں حائل تھیں کہ جب تک ان سے نجات نہ ہو جائے مسلمان اپنی بگڑی کو بنا نہ سکتے تھے۔ دونوں کی سعی یہ بھی تھی کہ کسی طرح مسلمان اپنے اساسی نظریات، اپنی تہذیب خاص کے شعور، اپنے امتیازی وجود اور اپنی ملت انا سے محروم ہو جائے ایک طرف انگریزی اقتدار اس کے درپے تھا کہ کسی طرح یہ سخت جان قوم مغرب کی مادی تہذیب کے عفریت کا جزو بدن بن جائے، دوسری طرف ہندو امپریلزم نے آہستہ آہستہ لادین سیاست اور متحدہ قومیت کا افسوں پڑھ کر یہ تحلیل ہو جائے۔ دو دشمنوں میں گھری ہوئی اس قوم کو مرعوب کن نظریات کے طلسموں اور مغالطہ انگیز سیاسی تحریکوں میں الجھانے کے علاوہ خوف اور لالچ کی مختلف شکلوں سے شکار کرنے کی لمبی تدبیریں بھی جاری کی گئیں اس کا شیرازۂ وحدت بکھر گیا اس میں مذہبی اور سیاسی اختلافات بھڑکائے گئے۔

اس میں ضمیر فروش غدار پیدا کیے گئے۔ اس کے کردار کو زخم لگائے گئے اس کو دنیوی مفاد سے محروم رکھ کر دین سے مہجور کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ملت کے اندر مغرب کی نظر سے دیکھنے اور مغرب کے دماغ سے سوچنے والا ایک طبقہ بھی ابھر آیا اور دوسری طرف ہندوؤں کے سیاسی منصوبے کو پورا کرنے والے عناصر بھی میدان میں آ گئے۔ عام علماء اور پیر عین اس دو طرفہ حملہ کے دوران میں اپنے انتہائی قدامت پرستانہ تصورات کے ساتھ قصر جمود میں پڑے مناظرہ و تکفیر کے مشغلوں میں گم تھے۔ اور جہالت اور معاشی بدحالی اور اخلاقی پستی کے مارے ہوئے عوام زندگی سے دور تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

یہ سب کچھ اقبال کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

بظاہر بے حد مایوس کن نقشۂ احوال تھا۔ اس سے نکلنے کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک تحریک انگیز ایمان و اعتقاد اور نصب العین کی تھی۔ یہ ایمان اور نصب العین جب اقبال کو اسلام کی بارگاہ سے ہاتھ آ گیا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے راہِ نجات کھولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پیغام جہاں غیر ملکی تہذیب سے بغاوت کا پیغام تھا۔ وہاں اس نے ان لادین وطنی تصورات کے خلاف حملہ ہائے مسلسل کا آغاز کیا جن پر یہاں کی سیاست چل رہی تھی لیکن یہ دو طرفہ منفی جنگ جس مثبت نصب العین کی خاطر لڑی جا رہی تھی وہ تھا احیائے اسلام یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام۔ انگریز سے آزادی حاصل کرنا تو چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نگاہ میں یکساں مطلوب تھا اور حالات کا ارتقاء بتا رہا تھا کہ یہ معرکہ سر ہو کے رہے گا۔ اب زیادہ تشویشناک مسئلہ یہ تھا کہ اگر تبدیلی اس طرح آئی کہ انگریزی اقتدار کی جگہ ہندو امپریلزم اپنی اکثریت کے بل پر وطنیت اور متحدہ قومیت کی قبا میں ایک لادین اسٹیٹ پر قابض ہو کر بیٹھ گیا تو جیلروں کی یہ تبدیلی مسلمان کی تقدیر کو بہتر نہ بنا سکے گی بلکہ صورتِ حال اور بھی سنگین ہو جائے گی۔ اس قسم کی تبدیلی سے نئی زندگی حاصل کرنے کے وہ تمام خواب

پریشان ہو جائیں گے۔ جو مسلمانوں کا سرمایۂ حیات تھے۔ علامہ نے اس صورت میں آنے والے خطرے کا ایک اور پہلو بھی چشم بصیرت سے دیکھ لیا تھا کہ اگر برطانیہ نے ہندو کے ہاتھ میں اقتدار دے دیا تو پورا مسلم ایشیا، روسی کمیونزم کی مٹھی میں چلا جائے گا۔

بنا بریں اقبال نے لادین سیاست اور وطنی قومیت کے خلاف بڑے زور سے فکری جنگ چھیڑ دی۔ لادین سیاست پر مبنی وطنی قومیت کو اقبال نے اسلام کے لیے کس درجہ خطرناک اور مسلمانوں کے لیے کتنا ہلاکت انگیز قرار دیا ملاحظہ ہو۔

"وطن سے محبت رکھنا اور اس کی عزت کے لیے مرنا مسلمانوں کے لیے جزو ایمان ہے مگر وطنیت اس وقت اسلام سے ٹکراتی ہے جب یہ ایک سیاسی تصوّر کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور انسانی اجتماعیت کا اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے — اور وہ بھی اس مطالبہ کے ساتھ کہ اسلام پیچھے ہٹ کر محض ایک انفرادی رائے کی حیثیت سے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک عامل کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ [1]

"— میں قومیت کے تصور کی بیخ کنی کے لیے اس وقت سے جدوجہد کر رہا ہوں جب کہ ہندوستان اور عالم اسلامی میں اسے پوری طرح سمجھا نہیں جا رہا تھا۔" [2]

اس لیے کہ یہ تصور مغرب کی امپریلیسٹ قوموں کا ہتھیار رہے جس سے وہ اسلام کی دینی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے کے لیے کوشاں ہیں پھر اس بات کو اور زیادہ کھول کر یوں کہا ہے کہ اسلام کسی ضابطہ سے جو انسانی معاشرہ کی

---

[1] تقاریر اقبال ص ۱۴۱

[2] تقاریر اور فرمودات اقبال ص ۲۰۴

تنظیم کرتا ہو کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا اسلام کا مکمل نظام حیات ہونا اور اس کے ہاں اخلاق اور سیاست یا مذہب و حکومت کی تفریق کا انکار پایا جانا اقبال کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ:-

"— کیا یہ ممکن بھی ہے کہ اسلام کو ایک اخلاقی نصب العین کے طور پر تو باقی رکھا جائے اور اسے ایک سیاسی حیثیت کے طور پر مسترد کر کے قومی سیاسی ہیئتوں کو قبول کر لیا جائے جس میں مذہبی نقطۂ نظر سے کام کرنے کا سرے سے اذن ہی نہیں۔" [1]

بالفاظِ دیگر:-

"مسلمانوں کا بہ حیثیت مذہبی ملّت کے ایک چیز ہونا اور بہ حیثیت سیاسی قوم کے دوسری چیز ہونا، ان دو باتوں کا اجتماع ممکن نہیں۔" [2]

مزید:-

"کیا ایک قومِ واحدہ کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور قانون کے معاملات میں خدائی ضابطہ کا اتباع کرے اور قومی تقاضوں کے زاویۂ نظر سے وہ ایک ایسے نظام کی پیروی کرے جو مذہبی نظام سے متصادم ہوتا ہو؟" [3]

دوسرے لفظوں میں لادینی وطنی سیاست کی راہ پر گامزن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سرے سے دین کا وہ زاویہ ہی ختم ہو جائے جو مسلمان کا سہارا ہے اور اسلام کے دورِ نو کی وہ منزل ہی کھو جائے جس کے لیے یہ ساری جادۂ پیمائیاں ہیں مختلف مذاہب کے گروہ اگر کسی متحدہ قومیت میں جمع کر دیئے جائیں تو وہ گروہ

---

[1] تقاریر اور فرمودات اقبال۔ ص ۲۰۶

[2] تقاریر اور فرمودات اقبال ص ۲۰۹

[3] فرمودات اقبال ص ۲۱۱

آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں اور لامذہبیت باقی رہ جاتی ہے ظاہر ہے کہ مذہب اور قوم پرستی دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اس کا نتیجہ لامذہبیت ہوگا۔ ایسا نہ ہو تو بھی اسلام محض ایک اخلاقی تصوّر کی سطح پر گر جائے گا جسے اجتماعی نظام سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

گویا اب دو چیزیں آمنے سامنے رکھی تھیں اور مسلمانوں کو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انگریز سے آزادی کا حصول، اپنے ملّی وجود اور اسلام کو قیمت میں دے کر یا ملّی وجود اور اسلام کو محفوظ اور مضبوط اور موثر بنانے کے لیے لادین وطنی تصورِ سیاست سے جنگ! اقبال نے موخرالذکر کا انتخاب کر لیا! اس دوسری صورت میں نظریۂ اسلامی بہت بڑا سرمایہ اور سرچشمہ حیات بھی تھا اور یہی نظریۂ اسلامی سیاسی کشمکش کے لیے مسلمانوں کے لیے سلاحِ جنگ بھی بن سکتا تھا۔

سو اقبال کے ہاں لادینی وطنی سیاست کے خلاف معرکہ آرائی کا منفی کام جس مثبت مشن کے لیے تھا۔ وہ اسلام کی تجدید کا زندگی افروز مشن تھا۔ اقبال کی نگاہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے بچاؤ کا یہی ایک ذریعہ و وسیلہ تھا اور بس! ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اقبال کے ہاں نظریۂ اسلامی کی مثبت دعوت برابر زور پکڑتی چلی گئی۔ وہ قوم کو انتہائی نتھرے ہوئے انداز میں اسلام کی معجزہ آفرین قوت کا یقین دلاتا ہے۔

"۔۔۔ مسلمانوں کی تاریخ کے نازک لمحات میں یہ اسلام ہی تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔"[1]

مزید فرمایا۔

"۔۔۔ آج اگر آپ اپنی نگاہوں کو اسلام پر مرتکز کر دیں اور اس میں

---

[1] فرمودات اقبال ص ۳۶

[2] فرمودات اقبال ص ۳۹

جو دائمی قوت آفرین تخیل مضمر ہے اس سے تحریک حاصل کریں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کی شیرازہ بندی کر لیں گے، اپنے کھوئے ہوئے عروج کو دوبارہ حاصل کر سکیں گے اور اپنے آپ کو مکمل بربادی سے بچا لے جائیں گے۔"

گویا دوسری صورت میں اقبال کے سامنے محض کسی چھوٹے یا بڑے نقصان کا معاملہ نہ تھا بلکہ مکمل بربادی کا خطرہ تھا۔ اسلام اس خطرہ سے بچاؤ کے واحد ذریعہ کی صورت میں اقبال کے سامنے تھا۔ اقبال نظریہ اسلامی اور جذبۂ احیائے اسلام کو مسلمانانِ ہند کی پوری تاریخ میں ان کی اصلاح و تعمیر کا سب سے بڑا عامل تسلیم کرتا ہے اسی لیے مستقبل کی تمام توقعات وہ اسلام سے وابستہ کرتا ہے

(جناب نعیم صدیقی)

تصورِ تجدید و احیائے دین

دین[1]، مسلمان کی زندگی کا لائحہ عمل ہے تو اس کے احیاء کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں میں سب سے بڑا مقدس، معزز اور تاریخی اجتماعی کام شمار ہوتا ہے۔ قرآن و سنت اگر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کا جامع نقشہ پیش کرتے ہیں تو قرآن و سنت کا نفاذ ان کی زندگی کا انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ مسلمان فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام گوشوں پر قرآن و سنت کا نفاذ کرے جو اس کے مالک اور آقا کا مجموعۂ احکام ہے اور جماعت کے لیے لازم ہے کہ افراد کی زندگیوں سے لے کر بین الاقوامی انسانیت تک ان احکام کے اجراء کا اہتمام کرے۔ یہی اس کی دنیوی زندگی کا حقیقی مطلوب اور اس کی اجتماعیت کا حقیقی مقصود ہے۔ اگر فرد انفرادی حیثیت میں اور جماعت اجتماعی حیثیت میں اس عظیم الشان فریضے کی طرف سے غفلت کریں تو وہ دنیا کی ذلت اور آخرت کی رسوائی سے نہیں بچ سکتے۔

اسی لیے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان کے بہترین افراد فریضہ اقامتِ دین اور احیائے دین کا کام کرتے رہے ہیں اور اسی کام کے تناسب سے ان کی قدر و قیمت اور مسلمانوں میں ان کی عزت و اہمیت کا اندازہ کیا جاتا رہا ہے مسلمانوں نے مال جمع کرنے، ممالک فتح کرنے اور قوموں کو غلام بنانے کے کارناموں کو کبھی اپنی تاریخ کا سرمایہ قرار نہیں دیا اور نہ ان کاموں کو مقامِ فخر و اعزاز پر

---

[1] استفادہ از "اقبال دارالاسلام" مودودی نمبر مؤلفہ سید اسعد گیلانی ص ۵۴

رکھا ہے لیکن اقامتِ دین اور احیائے دین کی کوششوں کو اپنی ملت کا اجتماعی قیمت سرمایہ اور اپنے وجود کا واحد مقصود و مطلوب قرار دے کر ہمیشہ اسے اپنی تاریخ کا زیور قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال بھی خدمتِ دین اور احیاء دین کو ہی اپنے لیے حقیقی مقصد زندگی قرار دیتے تھے۔ شعر و شاعری ان کے لیے کوئی وجہ افتخار نہیں تھی۔ سید سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"— میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں ہے اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی میں بعض خاص مقاصد کے لیے شعر کو استعمال کرتا ہوں" —"

اور وہ بعض خاص مقاصد احیاء دین کی جدوجہد کے سوا اور کوئی نہیں ہیں، مسلمانوں میں احیاء دین کی کوششوں کا ان کی تاریخ کی ہر صدی اور ہر دور میں ایک مسلسل ریکارڈ موجود ہے۔ چھوٹی بڑی کوششیں سنہری زنجیر کی طرح ہماری تاریخ کے دامن میں پھیلتی چلی گئی ہیں اور ہماری ملی زندگی کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب یہ کام کسی نہ کسی سمت اور کسی نہ کسی درجے میں سرانجام نہ پاتا رہا ہو، جو لوگ یہ کام کرتے رہے ہیں ہماری ملت انہیں رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی خطاب و اعزاز سے سرفراز کرتی رہی ہے۔ چاہے وہ اپنے دور میں جابروں اور ظالموں کا نشانہ ستم ہی بنتے رہے ہوں اور اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے علامہ اقبالؒ بھی احیاء دین کا کام کرنے والے بزرگوں کے سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہیں۔

ہماری تاریخ میں احیاء دین کی کوشش کرنے والے بے شمار مجددین، صالحین اور مجاہدین کی طرح علامہ اقبال نے بھی احیاء دین کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا، جو اس اس کام کا فطری طریقہ ہے۔

○ جاہلی انکار پر تنقید اور دلیل و برہان سے ان کا ابطال۔

- اسلامی افکار کی ترویج اور عقلی اور نقلی دلائل سے ان کی حقانیت کا اثبات۔
- خدا کی توحید کا انکشاف، نبوت کے مقام کی اہمیت و تشریح اور ملت میں ان دونوں کے فیصلہ کن حتمی مقام کا تعین۔
- مسلمانوں کی زندگیوں میں سے باطل کے غلبے کا توڑ، اسلامی اعمالِ صالح کا اہتمام اور مسلمان معاشرے میں مثالی مردِ مسلمان کا مقام اعزاز۔
- تمام ادیان کے مقابل میں دینِ اسلام کا غلبہ، ذہنی فکری اور بالآخر اجتماعی میدان زندگی میں۔

علامہ اقبالؒ نے عمر کا بڑا حصہ دین کا علم حاصل کرنے میں صرف کیا، اور پھر باقی ساری عمر دین کے احیاء کی کوشش میں گذار دی۔ ان پر دین کا حقیقی مفہوم سورج کی طرح عیاں تھا وہ کہتے ہیں۔

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور شریعت، اس کی سیاست مدن، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس روحِ اسلامی کے ساتھ مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے، جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں. جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔"

اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اسلام وحدتِ انسانی کو روح اور مادے کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادے، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔"

دین میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی حقیقی غرض و غایت کیا ہے اس امر پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

"اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں ہے کہ وہ ایک مذہب

ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بہ الفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر اور وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمن کو جرمنوں سے ہے وہی اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔"[1]

علامہؒ نے ایک باشعور حساس اور دردمند مسلمان مفکر اور مجاہد کی طرح زندگی کے مختلف گوشوں میں اپنی حد تک احیاء دین کا کام سرانجام دینے کی کوشش کی۔ امام حسینؓ کی عظیم الشان شہادت کے کارنامے سے لے جو احیاء دین کی اولین کوششوں میں اوّلین سرخیل کوشش ہے۔ آج تک مجاہدین، مجدّدِ دین اور ائمہ اسلام احیاء دین کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان میں علامہ اقبال کی کوشش کو بھی اپنی نوعیت اور اپنی طرز کا ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس کوشش نے احیاء دین کے کام کو غلبۂ دین تک پہنچانے کے لیے عمل کے میدان میں جو اقدامات کیے انہیں مسلمانوں کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے مسلمانوں کے ملّی تشخص کا اہتمام کیا۔ غیر مسلم اکثریت کے طوفانی سمندر میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لیے سلامتی کی کشتی کا نقشہ پیش کیا۔ انہوں نے ایک عظیم مفکر اور عالم ہونے کے باوجود ایک عملی سیاست دان کی طرح ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کی نقشہ گری میں بھرپور حصہ لیا اور ان کی نقشہ گری نے ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمتوں کو ایک مخصوص رُخ پر لگانے میں عظیم الشان کردار ادا کیا۔ ان کی احیائے دین کی کوششیں تاریخ کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے جغرافیائی نقشوں کو بدلتی ہوئی نظر آتی

ہیں۔ انہوں نے اپنی قوتِ افکار سے دین کے حقائق کو سائنس کے حقائق سے زیادہ محکم، زیادہ برتر اور مکمل طور پر ناقابلِ تردید ثابت کر دیا۔

اپنی جدوجہد میں اسلامی جماعت کے فرد کی تیاری بھی ان کے پیشِ نظر رہی ہے۔ انہوں نے مردِ مومن کو مثالی انسان کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہ اپنی جدوجہد میں صدائے لا الہ الا اللہ کو نغمۂ حریت و کلمۂ انقلاب کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب نظامِ باطل غالب ہو تو یہ صدائے انقلاب سینوں میں مدہم پڑتی چلی جاتی ہے۔

؎ گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اقبال کی تصوراتی اسلامی ریاست خلافتِ راشدہ کی تمثیل ہے جو دین و دنیا کا حسین امتزاج ہے، اس کی سیاست مذہب و اخلاق پر مبنی ہے اور اس ریاست میں سیاست، مذہب و اخلاق کے تابع ہے اس لیے کہ سیاست جیسے اجتماعی عمل میں جہاں قدرت و اختیار ہو، اگر وہ اخلاق کے تابع نہ ہو تو انسان درندہ اور ریاست خوف ناک عذاب کدہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

انہوں نے اپنے چھ لیکچروں میں جو "الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" کے نام سے شائع ہوئے فرمایا:

"اصولِ توحید کو نوعِ انسانی کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا واحد عملی طریقہ اسلام بہ حیثیت ایک سیاسی

نظام ہے۔ یہ خدا کی وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے نہ کہ تخت و تاج کی وفاداری کا۔ اور چونکہ خدا زندگی کی حتمی روحانی بنیاد ہے۔ اس لیے خدا سے اس کی وفاداری درحقیقت خود انسان کی مثالی فطرت سے وفاداری کے مترادف ہے۔"

اس لیے اقبالؒ اپنی مثالی اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا حقدار صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری،

علامہ اقبالؒ اس دور کی قومی ریاستوں اور اسلامی ریاست کے فرق کو خوب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے علم و ایمان کی بنا پر صرف اسلامی ریاست کے احیاء کے حامی ہیں۔ قومی ریاستوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے چاہے وہ مسلمانوں کی اپنی ریاستیں ہی کیوں نہ ہوں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے، جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ چونکہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے لہٰذا انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف ریاست ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل صرف معتقدات پر مبنی ہو سکتا ہے۔ یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک اُمت

کی تشکیل اور بقاء کے لیے ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ راہ لادینی کی راہ ہوگی اور شرف انسانی کے خلاف۔"

انہوں نے مزید کہا۔

"اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک انقلابی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی مسلمانوں کی حقیقی اساس توحید اور ختم نبوت کے عقیدے پر ہے۔"[1]

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا:

"میرے نزدیک حکومت اور طرزِ حکومت عوام کے کردار کی تشکیل میں فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں۔ سیاسی قوت کے چھن جانے سے قوموں کے کردار تباہ ہو جایا کرتے ہیں۔ جب سے ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہوا ہے ان کا اخلاقی انحطاط بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔"

پنڈت نہرو کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"جس قوت نے مسلمانوں کو تاراج کر دیا ہے وہ مسلمان بادشاہوں کی ملوکیت ہے۔"

غرض علامہ اقبالؒ ہر اس ادارے کے مخالف ہیں جو احیائے دین کے راستے میں رکاوٹ بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "مسلم تہذیب" میں لکھا جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔

---

[1] ۔ خط بنام مولانا حسین احمد مدنی۔ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۸ء

"اسلام محض ایک مذہبی نظریے کا نام نہیں ہے۔ اسلام ہمارے لیے ایک وسیع مطلب کا حامل ہے۔ ہماری نظر میں اسلام کا حتمی مقصد ایک ملک ہے جس میں ہم اسلامی شعار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"[1]

اسی لیے ایک مشہور قوم پرست مسلمان رہنما کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے لکھا۔

"ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے، لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر ہو جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ ایک طویل عرصے سے دین کے احیاء کے لیے ایک علیحدہ خطۂ زمین کا تصور قائم کر چکے تھے۔ وہ ہندوستان کے مروجہ سیاسی حالات میں اس کے اندر رہتے ہوئے کسی نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن تصور نہیں کرتے تھے چنانچہ ان کا ذہن مسلم اکثریت کے صوبوں کو ایک علیحدہ آزاد وفاق کی صورت میں تشکیل دے کر ایک اسلامی مملکت کی صورت دینے کی طرف زیادہ مائل تھا۔

جس علاقے میں علامہ اقبالؒ کی نظریاتی ریاست کے وجود میں آنے کا امکان تھا، اس کے ممکنہ مسلمان باشندوں کی نفسیات کے بارے میں بھی علامہ اقبال نے اپنے تخمینے اور اندازے بیان کیے، تاکہ جدوجہد کرنے والوں کے سامنے میدانِ عمل کی حقیقی نوعیت موجود رہے۔ علاقہ پنجاب کے بارے میں انہوں نے مولوی عبدالحق ۱۹۲۶ء میں ایک مکتوب میں لکھا۔

"مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں لڑنی پڑیں گی ان کا میدان

---

[1] سنس رپورٹ میں شائع شدہ مضمون "مسلم تہذیب"، ۱۹۱۱ء

پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ کی رزنگاہ یہی سرزمین پنجاب معلوم ہوتی ہے۔"

چنانچہ پاکستان کی جدوجہد، تشکیل اور بعد کی تاریخ میں علامہ اقبالؒ کی نظر میں پنجاب کے مسلمانوں کی اس ناقص اسلامی تربیت کا رنگ صاف جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی طرف انہوں نے قبل از وقت اشارہ کیا تھا۔

وہ اپنی مطلوبہ ریاست کے باشندوں کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے پٹھانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اسلامی قانون کا مزاج ہی یہ ہے کہ اس میں حق العباد سب باتوں پر مقدم ہے اور میں پٹھانوں کا اس لیے عاشق ہوں کہ ان لوگوں میں اسلامی روح بیدار اور زندہ ہے مجھے امید ہے کہ اگر خدا نے چاہا اور مسلم اسٹیٹ قائم ہوئی تو میری توقعات پٹھان ہی پوری کریں گے۔"[1]

جہاں تک کردار کا تعلق ہے علامہ اقبالؒ کے نزدیک مسلمان کا کردار ہی اس کی حقیقی قوت ہے، اور کردار کی حقیقی قوت توحید پر ایمان اور عملِ صالح ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علمِ کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلمان ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

---

[1] ۔ روایت، وقار انبالوی، ہفت روزہ چٹان ۸ مئی ۱۹۶۷ء

واعظین اور علماء جو مسلمانوں میں روحِ اسلامی کو زندہ رکھنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار اور نظامِ اسلامی کے احیاء کے بلند آہنگ نقیب ہیں، ان کی بے عملی کے پیشِ نظر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اے میرِ سپاہ تیری سپاہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

علماء کی عمومی بے عملی کے سبب انہوں نے مسلمانوں کے دینی رہنماؤں کو پکارتے ہوئے کہا۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
تیرے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

انہوں نے ان حضرات کو تفریقِ مسلک کے جھگڑوں سے بالاتر رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مغربی تصوراتِ قومیت سے متاثر نام نہاد سیاسی قوم پرستوں کو مخاطب کر کے کہا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

حقیقت یہ ہے کہ وہ دینِ اسلام کے مقابلے میں سارے جدید نظریات کو مسترد کر چکے تھے اور پوری شرحِ صدر سے ان جدید نظریات کو گمراہ کن سمجھتے تھے۔

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم، یا زمانۂ حال کے دوسرے ازم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" [1]

خطباتِ مدراس میں انہوں نے کہا۔

"نہ قرونِ وسطیٰ کا تصوّف، نہ قومیت اور نہ ملحدانہ سوشلزم ہی یاس زدہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر سکتے ہیں۔" [2]

مزید اضافہ کیا۔

"میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔" [3]

اور قرآن پر محکم ایمان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"معاشی مسئلہ کا حل اسلامی آئین کی تنقید ہے۔ اس سے ہر ایک کا حقِ معیشت محفوظ ہو جاتا ہے ——— بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن نے تجویز کیا ہے۔" [4]

اقبالؒ دین اور وطنیت کے تصادم کے باریک مقام کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے معیار پر اسلام کو نہیں پرکھتے تھے جیسا کہ بعض قوم پرست مسلمان کیا

۱۔ اقبال نامہ، جلد ۲، صفحہ ۱۸۹

۲۔ خطبات تشکیل جدید صفحہ ۱۸۹

۳۔ خطبات اقبالؒ صفحہ ۱۰۱

۴۔ روزنامہ زمیندار، ۲۳ جون ۱۹۳۳ء

کرتے ہیں، بلکہ اسلام کے معیار پر مسلمانوں کو پرکھتے تھے۔ جو قرآن و سنت کا معیار ہے۔ ان کے خوابوں میں اسلامی ریاست تھی وہ مسلمانوں کی قومی ریاست نہیں تھی بلکہ ایک ایسی اسلامی ریاست تھی جو مضبوط، واضح، ٹھوس اصولوں اور مستقل نظریات پر قائم تھی۔ وہ مسلمانوں کی ہر جدوجہد کا مقصود صرف احیاءِ دین کو ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے سوا مسلمانوں کی جدوجہد ان کے نزدیک بدنصیبی کے دھکے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔

"فی الحقیقت جس چیز کو اہمیت حاصل ہے، وہ آدمی کا عقیدہ، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات ہیں میری نگاہ میں یہ چیزیں اس قابل ہیں کہ جن کی خاطر آدمی کا جینا اور مرنا ہو، نہ کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ عارضی طور پر روحِ انسانی کا رابطہ ہو گیا ہو۔" [1]

اس بات کو مزید واضح اور حالات و واقعات پر منطبق کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔" [2]

اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

وطن سے محبت رکھنا اور اس کی عزت کے لیے مرنا مسلمانوں کے لیے جزوِ ایمان ہے، مگر وطنیت اس وقت اسلام سے ٹکراتی ہے جب یہ ایک سیاسی تصور کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور

۱۔ خطباتِ ارشادات انگریزی صفحہ ۵۶

۲۔ مکتوب بنام قائداعظمؒ ۱۹۲۷ء

انسانی اجتماعیت کا اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، اور وہ بھی اس مطالبے کے ساتھ کہ اسلام پیچھے ہٹ کر محض ایک انفرادی رائے کی حیثیت سے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک عامل کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔"[1]

تقریباً یہ وہی بات ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے تھے کہ کردار کے بغیر ریاست کا قیام ایک قومی ریاست تو وجود میں لا سکتا ہے لیکن ایک نظریاتی ریاست کا وجود ممکن نہیں ہے، ظاہر ہے کہ نظریاتی ریاست اس کردار سے ہی وجود میں آتی ہے جو اپنے اندر نظریات کو عملی طور پر سموئے ہوئے، اور وہ ان نظریات پر اپنے عمل سے شہادتِ حق پیش کر رہا ہو۔

اپنی مطلوبہ ریاست میں اقتصادی نظام پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا۔

"اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے شریعتِ حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بناء پر ایک جماعت کو مغلوب نہ کر سکے۔ اس مدعا کے لیے میرے عقیدے کی رُو سے وہی راہِ قابلِ عمل اور آسان ہے جس کا انکشاف شارعؑ نے کیا ہے۔"[2]

وہ نظامِ زندگی میں دوئی کے قائل نہیں تھے جو قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام کو ایک اخلاقی نصب العین کے طور پر تو باقی رکھا جائے اور اسے ایک سیاسی حیثیت کے طور پر مسترد کر کے قومی، سیاسی ہیئتوں کو قبول کر لیا جائے جس میں مذہبی نقطہ نظر

---

[1] روزنامہ زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء

[2] خطبات و فرمودات اقبالؒ انگریزی صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱

سے کام کرنے کا سرے سے اذن ہی نہ ہو۔"[1]

انہوں نے مزید فرمایا۔

"مسلمانوں کا بہ حیثیت مذہبی ملت کے ایک چیز ہونا اور بہ حیثیت سیاسی قوم کے دوسری چیز ہونا، ان دونوں باتوں کا اجتماعی ممکن نہیں ہے۔"[2]

اسی بحث میں انہوں نے کہا۔

"کیا ایک قومِ واحدہ کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور قانون کے معاملات میں خدائی ضابطہ کا اتباع کرے اور قومی تقاضوں کے زاویۂ نظر سے وہ ایک ایسے نظام کی پیروی کرے جو مذہبی نظام سے متصادم ہو۔"[3]

مسلمانوں کی از سرِ نو ترقی پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

"مسلمانوں کی تاریخ کے نازک لمحات میں یہ اسلام ہی تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا ہے نہ کہ اس کے برعکس ——— آج اگر آپ اپنی نگاہیں اسلام پر مرتکز کر دیں، اور اس میں جو دائمی قوت آفرین تخیل مضمر ہے اس سے تحریک حاصل کریں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کی شیرازہ بندی کر لیں گے، اپنے کھوئے ہوئے عروج کو دوبارہ حاصل کر سکیں گے اور اپنے آپ کو مکمل بربادی سے بچائے جائیں گے۔"[4]

چنانچہ علامہ اقبالؒ کے تصورِ احیائے دین کی وضاحت کرتے ہوئے

---

[1] - ارشادات و فرمودات اقبال انگریزی، صفحہ ۸

[2] - فرمودات اقبالؒ انگریزی صفحہ ۲۰۹

[3] فرمودات اقبالؒ صفحہ ۲۱۱

[4] - فرمودات اقبال صفحہ ۲۶

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لکھا ہے۔

"اقبالؒ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے انسانی رہنمائی کے لیے کوئی نیا راستہ تراشا ہے، بلکہ وہ ہمیشہ کہتے رہے کہ یہ وہی راستہ ہے جس کو خداوند کریم ابتدائے آفرینش سے آج تک بتاتا رہا ہے اور جس کو اسلام نے مکمل تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے"[1]

اقبالؒ اپنے خطبات میں اسلامی نظامِ حیات کی حقانیت ثابت کرنے اور اس کے نفاذ کے لیے ایک مردِ مومن کی تشکیل ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے لکھا۔

"جماعت مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لیے انسان کو مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے اور اسلامی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگنا چاہیئے۔ صبغۃ اللہ کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں"

اس طرح علامہ اقبالؒ مکمل طور پر ایک ایسے مصلح نظر آتے ہیں جن کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اسلام کے مطابق بنانا اور اسلام کو مسلمانوں کی زندگی کا مشن اور لائحہ عمل بنانا مقصود ہے وہ اسلام کو محض ایک معاشرتی مسلک کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی اور ایک ہمہ گیر انقلابی مشن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور اس مسلک کی بناء پر وہ ایک نظریاتی ریاست، ایک واضح معاشرہ اور ایک عادلانہ نظامِ قانون قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ کلمہ طیبہ کو ہی اخلاق و کردار کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ اس تحریک کی مشکلات سے خوب آگاہ ہیں جو اسلامی نظامِ زندگی

---

[1] ۔ چٹان، ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء

برپا کرنے کے لیے اٹھا کرتی ہے۔

چو گویم من مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

وہ اس کلمۂ حق کو ہمہ پہلو زندگی کا درد بناتے اور اسی سے زندگی کے ہر مسئلے کا حل تلاش کرتے ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمۂ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

نغمۂ توحید کی اس بلند آہنگ لئے کے ساتھ حضور اکرمؐ سے محبت بھی اس کے رگ و پے میں خون کی طرح گردش کرتی ہے جو اسلامی تحریک کے مستقل قائد اور چشمۂ قلب و نظر کی ٹھنڈک اور دل کی تشکیل ہیں۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ است
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

توحید کے شعور و اہتمام اور محبتِ رسولؐ کی بے خودی سے ہی ایمان کی تکمیل

ہوتی ہے۔ ان کی یہی کیفیت قرآن کے بارے میں تھی۔ وہ قرآن کو آخری کتابِ ہدایت سمجھتے اور ساری انسانی مشکلات کے لیے شاہ کلید قرار دیتے تھے آخری عمر میں انہوں نے اپنا سارا کتب خانہ بند کر کے صرف قرآن سے ہی تعلق باقی رہنے دیا تھا۔ اور سارے مسائل کا حل اسی کتاب میں تلاش کرتے تھے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اس طرح اقبالؒ نے اپنے عہد میں تجدید و احیاءِ دین کی زبردست جدوجہد کی۔ اس کے لیے انہوں نے ہر ممکن سعی کی۔ علمی اور عملی سطح پر ان کی مساعی ہمہ گیر تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ احیاءِ دین کے جس پودے کو انہوں نے راتوں کو جاگ جاگ کر سارے زمانے سے لڑ کر اور اپنا خونِ جگر جلا جلا کر پالا تھا بالآخر وہ پودہ برگ و بار لایا۔

علامہ اقبالؒ اپنے دور کے ایک کامیاب مصلح تھے۔ انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کے برگ و بار خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کسی مصلح کی اس سے بڑی اور کوئی خوش نصیبی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی دعوت اصلاح کو اپنی آنکھوں سے جڑ پکڑتے ہوئے دیکھے، یہی وہ نسبت ہے جو اقبالؒ کو حضورِ اکرمؐ سے بطور خاص حاصل تھی۔

(سید اسعد گیلانی)

تصورِ اجتہاد

گذشتہ صدیاں مسلمانوں کے لیے بہت جان لیوا ثابت ہوئیں۔ ان غلامانہ صدیوں میں علامہ اقبال کی رائے میں مسلم معاشرہ اجتہاد کی نعمت سے محروم ہو گیا۔ علامہ اقبال کو اس امر کا شدید احساس تھا۔ وہ فقہ کی تدوین جدید کو وقت کا اہم ترین تقاضا قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے۔"[1]

سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے اصول قانون Juiprudence پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہو گا۔ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"[2]

---

[1] "حیات انور" صفحہ ۱۶۰

[2] "اقبال نامہ" صفحہ ۵۰۔

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم اسلامی قوانین کی تجدید کے کے انتہائی فکرمند تھے۔ وہ عالم اسلام میں خیالات کے نئے دھاروں کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کر رہے تھے اور یہاں پر بڑھتے ہوئے مغربی اثرات پر اس کو بہت تشویش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ذہین طبقہ کو اس خطرے کا اندھا دھند شکار ہو جانے سے روکا جائے آپ نے اس احساس کا اظہار مختلف مقامات پر کیا۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں[1]۔

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے (سید سلیمان ندوی) اس کام کو کون کرے گا میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا، مگر چونکہ بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھی کئی امور کے متعلق استفسار کیا تھا کہ ہندوستان کی جمعیت العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔ ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو[2]۔

"ہمیں دیوبند اور لکھنؤ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہئیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں۔ چونکہ قانون محمدیؐ سرتاسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے، ہم کو چاہیے کہ انہیں اصول فقہ و

---

[1] ۔ استفادہ از اقبال اور احیائے دین مرتبہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۷۸

[2] ۔ خط بنام سید سلیمان ندوی، اقبال نامہ ج ۱ صفحہ ۱۴۲

قانون سازی کے اصولوں کی تعلیم دیں اور شاید اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر ان سے کہا جائے کہ سیاسی نظریۂ اسلامی اور اسلامی فقہ کا ارتقاء وغیرہ مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں۔ بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لیے وقف کر دیں۔ اس ملک میں قانون محمدیؐ جس طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ نہایت تاسف انگیز ہے اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف مجلس قانون سازی کے قیام سے ہی دور ہو سکتی ہیں"[1]

مسلمانوں کے فقہی سرمائے کی تدوین جدید ان کی تحریروں کا مرکزی نقطہ رہا ہے اس کے لیے انہوں نے دو طریقے اختیار کیے۔ ایک تو ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو اس ضرورت کا احساس دلایا اور اس ضمن میں کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔ اور دوسرے یہ کہ انہوں نے خود بھی اس میدان میں کچھ کام کیا۔ جہاں تک تجاویز کا تعلق ہے ان میں سے دو ایک کا ذکر اوپر ہوا ہے، کچھ مزید ملاحظہ فرمائیں۔

۔ میں علماء کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا جس میں وہ مسلمان وکلا بھی شامل ہوں جو فقہ سے واقف ہوں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور تجدید ہو۔ لیکن اس طور پر کہ بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے اس جماعت دستوری سند حاصل ہو تاکہ قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لاء پر اثر انداز ہوتا ہو اس اسمبلی کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے محض عملی فائدہ کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانہ حاضر میں مسلم و غیر مسلم) کو ابھی اسلام کے قانونی ادب

---

[1] ۔ لیکچر برائے علی گڑھ یونیورسٹی، اقبال نامہ ج ۲ صفحہ ۲۲۰ ۔

کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں۔ خصوصاً سرمایہ دارانہ ذہنیت کی دنیا کے لیے جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں اس قسم کی اسمبلی کا قیام اسلامی اصول سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔[1]"

"مسلمانوں کی مجالس ہائے قانون ساز میں علماء کو اس کا ایک اہم اور مؤثر جز ہونا چاہیے۔ اور وہ اس کے رکن کی حیثیت سے قوانین شریعت پر آزاد بحث و تمحیص میں معاونت اور رہنمائی کریں۔ احکام شریعت کے تعین میں غلطیوں کے سدباب کا مؤثر طریقہ ایک ہی ہے اور وہ مسلم ممالک میں فقہی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی ہمہ گیر اصلاح ہے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصول قانون سازی کو طلبہ کے درس کا لازمی جز قرار دیا جائے۔"[2]

"مسلمان ممالک میں روح جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالس قانون سازی کی تشکیل ایک فال نیک ہے۔ دور حاضر میں جب کہ اُمت میں مختلف مکاتب فکر پیدا ہو گئے ہیں، انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد (یعنی افراد کے مقابلے میں یہ حق مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کیا جائے تو) زیادہ مفید ہے۔ اس جدید دور میں اجماع کی یہ شکل سب سے زیادہ موزوں ہو گی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ قانونی معاملات پر ان غیر فتح ارباب بصیرت کو بھی اظہار خیال کا موقع مل جائے گا جن کی نظر عملی پہلو پر زیادہ گہری ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام

---

[1] ۔ خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء حرف اقبال صفحہ ۸۲۔

[2] ۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۱۷۶

قانون کو جمود و تعطل سے نجات دلا کر اس میں زندگی کا نیا خون دوڑا سکتے ہیں اور اسے زیادہ ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طریق کار کے اختیار کرنے میں ہندوستان میں چند دشواریاں پیدا ہوں گی، اسی لیے یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اس درجہ اختیار دیا جا سکتا ہے۔"[1]

"میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں "قدیم" ایک ایسا ہی عنصر ہے جیسا کہ "جدید"، بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں بلتے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں اس بے خبری سے آپ کی اصلاح میں یورپ کے معنوی اصلاح کا اندیشہ ہے جس کا سدباب ضروری ہے میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے دماغی اعتبار سے ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔"[2]

حضرت علامہؒ کے نزدیک اسلام کے بنیادی اصول دائمی ہیں اور انسانی معاشرت و تہذیب ایک تسلسل رکھتی ہے اس لیے ہر دور کے لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں کے محتاج ہیں اور انہی اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی تغیر پذیر زندگی کو ہمیشہ درست اور مستحکم رکھنا چاہیے وہ اسلامی قانون کے ماخذ پر بحث کرتے ہوئے فقہاء کے مسلک سے سرمو انحراف نہیں کرتے قرآن، سنت، اجماع اور

---

[1] ۔ ایضاً صفحہ ۱۷۴

[2] اقبال نامہ ج ۱ صفحہ ۱۲۸۔

قیاس کو وہ اسلامی قانون کے ماخذ تسلیم کرتے ہیں اور اس پر بڑی بصیرت افروز بحث کرتے ہیں[1]۔ اقبال کے ہاں سب سے اہم بحث اجتہاد کی ہے۔ وہ اجتہاد کو مسلم ملت کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ وہ اجتہاد کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس لفظ کا لغوی ترجمہ کد و کاوش اور جد و جہد کرنا ہے اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کے معنی کسی قانونی سوال پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے انتہائی کرنے کے ہیں"[2]

اس تعریف میں آزادانہ رائے کی اصطلاح سے غلط مفہوم لیا گیا ہے علامہ اقبال مطلقاً آزاد خیالی کے حامی ہیں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ علامہ مرحوم آزادی رائے کے قائل تھے لیکن ایسی آزادی جو کتاب و سنت کی حدود میں ہو ——— آزاد فکری کے بارے میں ان کی رائے ڈھکی چھپی نہیں، فرماتے ہیں۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ایک اور مقام پر دور حاضر کی آزاد فکری کے بارے میں فرماتے ہیں۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۵۵۔
[2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۲۸۔

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

فکری کی بے قید وادیوں میں پہنچا دے اور اسلاف سے اس کا رشتہ توڑ دے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دین کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

علامہ کے عہد میں کچھ مسلمان اس مذموم آزاد فکری کا شکار تھے، آپ اس پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدہ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

علامہ اقبال اجتہاد کو معاذؓ کی روایت پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ آپ اجتہاد کے لیے افراد کی بجائے جماعت کو اہل قرار دیتے ہیں اور جماعت بھی ایسی جو دینی بصیرت رکھنے والے افراد پر مشتمل ہو۔ وہ بے علم اور کم علم

لوگوں کے اجتہاد کو ناقابل قبول اور مہلک قرار دیتے ہیں۔ رموزِ بے خودی میں اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر آپ نے بڑی خوبصورت بات کی ہے۔

ز اجتہاد عالمان کم نظر — اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر
عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست — کار پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکر شاں آید ہمی باریک تر — در ع شان با مصطفےٰ نزدیک تر

علامہ مرحوم کے نزدیک اسلاف کی آرا اور ان کی کاوشیں بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اسلاف کی عقل خواہشات کی تابع نہ تھی، اسلف صالحین کے کارنامے غرض مندی سے آلودہ نہیں تھے اسوۂ نبوی سے قرابت کے باعث ان کے فکر و نظر میں باریکی اور گہرائی میں پختگی تھی۔

اسلام سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قوم روشن از سواد سرگذشت
خود شناس آمد ز یاد سرگذشت
سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

علامہ اقبال اجتہاد کو مسلم ملت کے لیے استحکام و ثبات کا باعث سمجھتے ہیں مگر وہ اجتہاد جو قرآن و سنت کی حدود کے اندر ہو اور روح اسلام کے خلاف نہ ہو اجتہاد کے ضمن میں علامہ کی راہ اعتدال کی راہ ہے۔ وہ نہ تو تقلید محض کو صحیح قرار دیتے ہیں جو ترقی کی دشمن ہے نہ اجتہاد بے قید کو جو انتشار پر منتج ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر خالد علوی)

تصورِ انقلابِ اسلامی

اقبالؒ ایک ایسے دور میں پیدا ہوا جب کہ مسلمانوں نے غلامی پر رضامندی اختیار کر رکھی تھی۔ اقبال بھی اپنی قوم کی طرح غلام تھا۔ لیکن وہ ایسا غلام تھا جس نے ساری عمر اپنی اور اپنی قوم کی رہائی اور آزادی کی فکر میں صرف کر دی۔ اقبال آنکھ کھولتا ہے تو اسے ایک بہت بڑی چیز نظر آتی ہے اور وہ ہے ہمالہ پہاڑ۔ اقبال اسی پہاڑ سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ آسمان جھک کر ہمالہ کی پیشانی کو چومتا ہے۔ اقبال خود ایک پہاڑ بن جاتا ہے اور قوم کو للکارتا ہے کہ وہ بھی ایک پہاڑ کی طرح اٹل اور آزاد ہو جائے۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے متعلق بعض حلقوں کا خیال ہے کہ شروع میں اقبال ہندوستانی قومیت کا نقیب تھا۔ اقبال کی نظمیں ترانہ ہندی اور ہمالہ کو اس دور کا ترجمان بتایا جاتا ہے۔ یہ خیال میرے نزدیک اقبال کے ساتھ بے انصافی سے کم نہیں فصیلِ کشورِ ہندوستان، محض ایک جغرافیائی حقیقت بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ جب اقبال ترانہ ہندی لکھتا ہے تو گنگا سے ایک بدیسی کی حیثیت سے پوچھتا ہے کہ کیا گنگا کو وہ دن یاد ہیں جب وہ کارواں، جس کا اقبال ایک فرد ہے، اس دیس میں اترا تھا؛ ترانہ ہندی کے آخری شعر میں ایک دردِ نہاں، کا تذکرہ بے معنیٰ نہیں۔ یہ وہ درد ہے جس کا کوئی محرم اقبال کو ہندوستان میں نہیں ملتا۔ اور یہ درد ہی اقبال کو ساری زندگی بے چین رکھتا ہے۔

اقبال کا یہ دردِ دل دراصل تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ نے جو رُخ اختیار کیا اقبال اس کی شکایت اپنوں سے غیروں سے اور خدائے تعالیٰ تک سے

بار بار کرتا ہے۔ دورِ اوّل کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کا عنوان، صدائے دور ہے اس نظم کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے۔ یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی اقبال کے مذہب میں شروع ہی سے حرام تھی ؎

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اقبال کے ذہن میں تاریخ کا ایک خاکہ ہے۔ اسی خاکے میں شاعر پوری تاریخ کو پرو دیتا ہے اقبال انسان کے اس مقام سے آگاہ ہے جو خالقِ حقیقی نے اسے عطا کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ انسان اس مقام سے دور، بہت چلا گیا ہے۔ اقبال حق اور باطل کی ایک مسلسل جنگ سے آشنا ہے، وہ ہم کو بتاتا ہے کہ چراغِ مصطفوی اور شرارِ بولہبی میں شعلہ کاری ازل سے تا امروز جاری رہی ہے۔ اقبال جانتا ہے کہ جس دور میں وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں بولہبی کو بالادستی حاصل ہے اس کی تمام کوشش یہ ہے چراغِ مصطفوی کو دوبارہ روشن کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کی روشنی شرارِ بولہبی پر غالب آجائے۔

اقبال کے یہاں ایک خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اقبال ہر چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کو اس کی دائمی اور لامحدود سطح پر دیکھتا ہے اور بیان کرتا ہے شمع کو چھوٹا سا طور کہتا ہے اور پروانے کو ذرہ سا کلیم۔ اگر دہقان کی مثال دیتا ہے تو اسی میں اقبال کو دانہ، کھیتی، باراں سب ہی نظر آجاتے ہیں۔ اگر جستجو کو آوارہ پاتا ہے تو اسی میں راہ، رہرو، رہبر اور منزل سب بیان کرتا ہے اگر طوفان کا سامنا ہے تو وہ یاد دلاتا ہے کہ تو ہی تو ناخدا ہے بحر ہے کشتی ہے اور ساحل ہے چاک گریباں

دکھلا کر کہتا ہے تو ہی قیس ہے۔ لیلا ہے۔ صحرا ہے اور محمل ہے۔ اور جب ہمیں اقبال محتاجِ ساقی پاتا ہے تو برجستہ کہتا ہے۔ مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو"

اقبال نے اپنے تیسرے مجموعۂ کلام "ضربِ کلیم" کو دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کہا۔ لیکن اس سے بہت پہلے "بانگِ درا" میں ہی یہ اعلانِ جنگ ہو چکا تھا۔ مثلاً ان دو اشعار میں اقبال ہمیں اسلامی انقلاب کی دعوت دیتا ہے ؎

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوب باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو
بے خبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

وہ چاہتا ہے کہ ہم شعلہ بن کر پھونک دیں خاشاکِ غیر اللہ کو غیر اللہ کی محفل میں اقبال ہمیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی"، گویا یہ کہ غیر اللہ کی تقلید اور نقل نہ ہمیں زیب دیتی ہے نہ ہی یہ فرمانِ الٰہی ہے

اقبال کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا سفینہ برگِ گل موجوں کی کشاکش کے باوجود دریا کے پار ہوگا۔ لیکن سارا قافلہ بیک وقت شاید اس پار نہ پہنچ سکے تو اقبال کو تلاش ہوئی قافلے کے اس حصّے کی جہاں پہل ہونے کا امکان ہو، تو دیکھئے اقبال کی حکیمانہ نظر کہاں پڑتی ہے۔ وہ نشان دہی کرتا ہے کہ: اگر تہران اقوامِ مشرق کا جنیوا GENEVA بن جائے تو شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے۔

اقبال نے ہمارے زمانے کے امام برحق کی سب سے پہلی تعریف یہ بتائی تھی کہ وہ ہمیں حاضر و موجود سے بیزار کر دے گا۔ اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارا امام ہمیں موت کے آئینے میں رُخِ دوست دکھا دے، اور ہم شہادت کے لیے بے چین ہو جائیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی امامت کی تیسری خصوصیت اقبال یہ بتاتا ہے۔ کہ

وہ ہمیں احساس زیاں دلا کر ہمارا لہو گرما دے اور مسلمانوں پر فقر کی سان چڑھا کر انہیں کفر سے نبرد آزما کر دے۔ اور جو قیادت ایسا نہیں کرتی اس کی قیادت کو اقبال فتنۂ ملت بیضا کہتا ہے اور ایسی لیڈر شپ مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار کر دیتی ہے۔

میرے نزدیک آج ساری دنیا میں جو مسلمانوں کی قومی مملکتیں وجود میں آگئی ہیں اور جن کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے ساری کی ساری مغرب کی نوآبادیاتی پالیسی کا نتیجہ ہیں اور ہر چھوٹے سے خطے کو ایک الگ تشخص اور نام اور قومیت دے دی گئی ہے۔ اس طرح اقبال کی زبان میں ہم نے جگہ جگہ اور جدا جدا عہد غلامی کر لیا ہے اور ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لیا ہے۔ اور ان قومی ریاستوں کی لیڈر شپ ہر جگہ فتنۂ ملت بیضا سے ہرگز کم نہیں۔ ان مقامی نام نہاد لیڈروں نے سیاست میں منافقت اور شرک کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور ہمیں سلاطین اور سپر پاورز کا ستار بنا دیا ہے۔ زمانے کی اسی روش کو دیکھ کر اقبال چیخ اٹھتا ہے ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے!

اقبال سارے جہاں کو صنم کدہ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک مقامی قومیتوں کا بت تراشیدۂ تہذیب نوی ہے اور غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے۔ اقبال مسلمانوں کو پکارتا ہے، للکارتا ہے اور دعوت دیتا ہے کہ ہم توحید کی قوت کو استعمال کریں۔ ہمارا دیں اسلام ہے اور مصطفوی ہیں اور ہمارا فرض یہ ہے ہم قومیت کے اس بت کو خاک میں ملا دیں اور ایک نظارہ دیرینہ زمانہ کو دکھا دیں، ہمالہ، ہی میں اقبال نے کہہ دیا تھا ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

اقبالؒ کے یہاں دو چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک ہے قومیت یا وطنیت، اور دوسری ہے مغرب زدہ طبقے کی لیڈر شپ۔ مغرب زدہ طبقے کی اقبال نے جگہ جگہ خبر لی ہے۔ ان کا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ ان کی تعلیم اور تعیش کا مذاق اڑایا ہے

ان کے کلچر کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کی 'دوئی'، کا مذاق اڑایا ہے اور ان کی لیڈر شپ میں مسلمانوں کا جو حشر ہونا تھا وہ اقبال نے تو کم، ہم نے اور آپ نے زیادہ دیکھا ہے۔ اس طبقے سے متعلق اقبال کا صرف ایک شعر پیشِ خدمت ہے ؎

ہیں ان کی محفل عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

دنیائے اسلام میں آج جتنے بھی حکمراں پائے جاتے ہیں ان سب کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کے گھر کو پھونک کر دینا کمانے اور نام پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ اقبال جب دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے اس کا ہدف نہ صرف مغرب کی تہذیب اور بالادستی ہے بلکہ اقبال کا اعلانِ جنگ ان لوگوں کے خلاف بھی ہے جو نام نہاد مسلمان تو ہیں لیکن ان کے ہاتھوں مسلم معاشرے کو لادینیت کی طرف تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے۔ اقبال کا انقلاب اسلامی مغرب کے اثرات کو جڑ سمیت اکھاڑ کر باہر پھینک دے گا۔ لیکن ہم کو یہ معلوم ہے اور یہ ہمارا تاریخی مشاہدہ بھی ہے کہ مغرب اپنے مفادات کا ڈٹ کر تحفظ کرتا ہے مغرب نے ہمارے اکثر اور بیشتر حکمرانوں اور مملکتوں کو خرید لیا ہے۔ قوم رسولِ ہاشمیؐ جب بھی فعال ہو کر ان مغرب زدہ حکمرانوں اور حکومتوں کے خلاف اعلان جنگ کرے گی، یہ داخلی اور بیرونی قوتیں باطل کے کفر و فکر کی حفاظت کے واسطے یک جا ہو جائیں گی اور تحریک اسلامی کا مقابلہ کریں گی۔

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی یہ جنگ ازل سے تا امروز جاری رہی ہے اور جاری رہے گی اس جنگ میں شرارِ بولہبی کا ساتھ منافقت نے ہمیشہ دیا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمانوں کی قومی حکومتیں آج تمام منافقت کی آماجگاہ بن چکی ہیں۔

اقبالؒ کے یہاں اگر ملتِ بیضا زندہ ہے تو عزبادہ کے دم سے امرا کو اقبالؒ دولت کے نشے میں غافل پاتا ہے اس کے نزدیک جو فقر سے بہرہ ور ہے تونگری سے

نہیں۔ امّت کی وحدت پر اقبالؒ بار بار زور دیتا ہے اس کے نزدیک جو رنگ و خوں کا امتیاز کرے گا مٹ جائے گا۔ اور وہ فرقہ پرستی کو ایک ہنگامۂ محشر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ؎

اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!

اسلام کو اقبالؒ ایک عوامی تحریک MASS MOVEMENT قرار دیتا ہے حریّت کا جو خواب اسلام نے دیکھا تھا اسی خواب کو اقبالؒ پھر دہرانا چاہتا ہے۔ جب وہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر کا خواب دیکھتا ہے تو مغرب کی جادوگری نے جو اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں ان کو یک لخت ختم اور رفنا کر دیتا ہے اقبالؒ صاف کہتا ہے کہ کسی خطۂ ارض کے مسلمان خود اکیلے اپنے مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے مسائل عالم گیر ہیں اور ان کے پاس ایک عالم گیر دین اور ایمان ہے، رسولؐ ہے، قرآن ہے، تاریخ ہے، اقبالؒ کے نزدیک عثمانیوں پر کوہ غم کا ٹوٹنا کوئی غم کی بات نہیں، اس لیے ؏

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

اقبالؒ کے یہاں اخوّت کی جہانگیری ملتی ہے اور محبت کی فراوانی۔ یہ وہ نسخہ ہے جس سے ملت میں پیدا شدہ بتانِ رنگ و خون ٹوٹ جاتے ہیں اور نہ تورانی نہ ایرانی نہ افغانی باقی رہ جاتے ہیں۔ خدا کے پاک بندوں کی زرہ اقبال نے استغنا بتائی ہے۔ ان عمل بے غرض بتایا ہے۔ ان کا فقر قیصر و کسریٰ کو ہلاک کر دیتا ہے ان کی نگاہ شوخ و بے باک ہے۔ اقبالؒ کا مومن فقیری میں بھی شاہی کرتا ہے اقبالؒ کا سپاہی بے تیغ بھی لڑتا ہے۔ بلکہ اقبالؒ کا مومن تو تقدیر الٰہی بھی بن جاتا ہے۔ اور جب تک مومن میں دلِ بیدار پیدا نہیں ہوتا اس کی ضرب کاری نہیں ہوتا اقبالؒ کے رندانِ پاکباز ساقیِ فرنگ سے سوال نہیں کرتے بلکہ محوِ خود نمائی رہتے ہیں اور تعمیرِ خودی میں خدائی تلاش کرتے ہیں۔ ایک مسلمان ایک وقت میں یا بندۂ خدا بن سکتا ہے یا بندۂ زمانہ۔ دونوں کی بندگی ممکن نہیں ہے سحر فرنگیانہ

کے جواب میں اقبال کرۂ قاہرانہ اور جذبِ قلندرانہ پیش کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ مردِ حق جن کو اقبال خلیلؑ کا لقب دیتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ دنیا کے اس صنم کدے کو پاش پاش کر دیں۔ جو مغرب کی ساحری اور مغربی تعلیم کے عمارت گروں نے بنایا ہے۔

اقبال کے نزدیک اس زمانے میں سب سے بڑا اسلامی انقلاب یہ ہوگا کہ مسلم ممالک اور معاشروں سے مغرب کے اثرات کو ختم کر دیا جائے اور مغرب کی سرمایہ داری اور سیاست نے ہمارے اوپر جو بالادستی حاصل کر لی ہے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔

اقبالؒ پیغمبرِ اسلامؐ کا عاشق ہے۔ وہ ہمیں بار بار دلاتا ہے کہ ہم اس کی اُمّت ہیں۔ اقبالؒ کے ذہن میں سنّتِ محمدیؐ کا ایک انقلابی نقشہ پایا جاتا ہے۔ اقبالؒ پیغمبرِ اسلام کو سالارِ کارواں کے روپ میں دیکھنا اور پیش کرتا ہے وطنیت کی سب سے بڑی خامی اس کے نزدیک یہ ہے کہ یہ غارت گرِ دینِ نبوی ہے۔ اقبالؒ جب شکوے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو پہلے ہی کہہ دیتا ہے کہ تیرے محبوبؐ کی امت دیوانی تو نہ تھی۔ خدائے تعالیٰ سے استفسار کرتا ہے کہ تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟ اور جب جوابِ شکوہ میں ہماری خبر لیتا ہے تو ؎

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

اگر اس تاریک دور میں اُجالا ممکن ہے تو صرف اسمِ محمدؐ سے اور چراغِ مصطفویؐ سے۔ اقبالؒ کبھی شہرِ یثرب کو پیغام بھیجتا ہے کبھی کملی والےؐ کو۔ بلکہ ایک وقت تو خود ہی شام و سحر کے نظام سے نکل کر حضورِ رسالت مآبؐ میں پہنچ جاتا ہے، اور ہمیں بتایا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردوں!

اور جب اقبالؒ اپنی دانش کے افرنگی ہونے کا اور اپنے ایمان کے زناری

ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو وہ مولائے یثربؐ کو اپنی چارہ سازی کے لیے بلاتا ہے دنیا کی ہر چیز اقبال کو آنی و فانی نظر آتی ہے۔ لیکن اسے ایک مقام پر رنگِ ثباتِ دوام بھی نظر آتا ہے اور وہ ثبات صرف عشقِ رسولؐ میں ہے ؎

عشق دم جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ　　عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

اور اقبال کے نزدیک اسی عشق سے نغمۂ حیات ہے، نورِ حیات ہے، اور ناموسِ حیات ہے۔ اقبال روحِ محمدؐ سے پوچھتا ہے کہ یہ آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟ لیکن غور فرمائیے کہ اقبال انگریز سے کس قدر بدظن ہے ؎

گر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز
سیاہ روزِ مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

اور ابلیس جب اپنے مشیروں سے خطاب کرتا ہے تو اسے ڈر صرف یہ ہے کہ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں شیطان کے نزدیک سب سے بڑا انقلاب جو ہے اسے اقبالؒ یوں بیان کرتا ہے ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور آخر میں جوابِ شکوہ کا آخری مصرع جو اقبال کے انقلاب اسلامی کا منشور ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(ڈاکٹر کلیم صدیقی)

تصوّرِ انقلاب و آزادی

مایوسی اور قنوطیت کے دور اور غزل خوانی اور رومان پروری کی خوابناک فضا میں اقبالؒ کی آواز ایسے بلند ہوئی جیسے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑتی ہے۔ یہ ایشیا کی درماندہ قوموں کی طرف سے مغرب کے استیلاء اور غلبہ کے پہلا اعلانِ جنگ تھا۔ ایشیا میں سرمایہ دار کے خلاف مزدور کا پہلا احتجاج تھا جب اقبالؒ نے کہا۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے اک پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزدیاں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اقبالؒ کی آواز تمام دنیا کے انسانوں کے لیے شرف و عزت کا پیغام لائی۔ اس نے مایوسیت کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے عظمتِ انسانی کا پیغام دیا۔ اس نے اس فلسفہ کی پوری شدت سے تردید کہ انسان خاک کا پتلا ہے اور دنیائے ناپائدار میں ایک ظالم اور تبدیل نہ ہونے والی تقدیر کے ماتحت کچھ وقت گزارنے کے لیے آیا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک حیاتِ انسانی کا مقصد خودی کی تلوار کے ساتھ تسخیرِ کائنات ہے۔ چنانچہ پیامِ مشرق میں میلادِ آدم کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ انسان کے پیدا ہونے سے کائنات کانپ اٹھی اور آسمانوں میں شور بپا ہو گیا کہ زندگی کے رخ سے پردہ اٹھانے والا پیدا ہو گیا ہے۔

ف استفادہ از نقوش سالنامہ ۱۹۸۵ شمارہ نمبر ۲۲ مضمون اقبال انقلاب شاعر مولانا عطاء اللہ سجاد ص ۲۸۷

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذرائے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

اقبال کے تمام کلام میں عظمتِ انسانی کا یہ پہلو آپ کو جا بجا آئے گا۔ ایک مقام پر اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہ انسان نے تخلیقاتِ خداوندی کو مسخ کرنے کی ہے اور جنگ و فساد کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

؎ تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس جواب سے کس قدر خود اعتمادی اور زندگی کو نیا رُخ اور موڑ دینے کے لیے تحریک ہوتی ہے۔ انسان نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ آپ نے رات بنائی تھی میں نے چراغ بنا کر اسے روشن کر دیا۔ آپ نے مٹی بنائی میں نے اس سے پیالہ بنا دیا۔ آپ نے پہاڑ اور جنگل بنائے میں نے باغ اور خیابان بنا دئے، میں نے پتھر سے شیشہ پیدا کر دیا اور زہر سے تریاق پیدا کر دیا۔

اپنی نظم "تنہائی" میں بھی اقبالؒ نے بحر و بر اور شمس و قمر پر انسان کے تفوق کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ذرّہ دردِ دل انسان کو کائنات کی دیگر چیزوں حتّٰی کہ الوہیت سے بھی ممیّز کرتا ہے۔ وہ سمندروں، پہاڑوں اور چاند اور سورج سے

سوال کرتے ہیں کہ ان کے پاس بھی دل کی دولت ہے یا نہیں لیکن کوئی جواب نہیں ملتا اور بالآخر ان سب مرحلوں سے گزرتے ہوئے حضرت یزداں کے پاس پہنچتے ہیں۔

شدم بہ حضرتِ یزداں گزشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنائم نیست
جہاں تہی زدل و مشتِ خاک من ہمہ دل
چمن خوش است ولے در خورِ نوائم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

شمع اور شاعر میں اگرچہ ان کا براہِ راست خطاب سے ہے لیکن اس میں ان تمام انسانوں کے لیے پیغامِ حیات ہے۔ جو احساسِ کمتری اور یاس پرستی کا شکار ہیں۔

اقبال کے نزدیک شرفِ انسانی کی تکمیل کے لیے خودی بے حد ضروری ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک خودی کا تصوّر انفرادی کبر و ناز کی پرورش یا زندگی کے تقاضوں سے بغاوت کا تصور نہیں ہے بلکہ خودی ان کے نزدیک معراجِ انسانیت کے لیے ایک زینہ ہے۔ خودی ان کے نزدیک زندگی کی ان اقدار سے وابستگی ہے جو انسان کو احتیاج اور خوف سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ خودی اس کے دل میں اپنے وجود اور اپنی حقیقت کے لیے ایک اعتماد پیدا کرتی ہے اور اس کے ارادوں میں استحکام اور عزائم میں پختگی پیدا کرتی ہے خودی اپنی منزل خود تلاش کرتی ہے۔

تراش از شیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

یہ خودی کا ہی اظہار تھا جس نے اقبالؒ سے کہلوایا۔

شنیدم کرمکِ شب تاب می گفت
خود افروزم چراغِ راہ خویشم
تواں بے منتِ بے گانگاں سوخت
نہ پنداری کہ من پروانہ کیشم

اقبالؒ جب جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور دنیا کے مختلف گوشوں کے زبوں حال انسانوں کو پیغامِ حیات دیتا ہے تو اس کے پیغام کی تحریک اسی منبعِ فیض سے ہے کہ جس نے دنیا کے سب سے بڑے بُتکدے کو خدائے واحد و قہار کی عظمت و جبروت کا نشان بنا دیا۔ اقبال کے شعور نے اس پر ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام ہی ایک طرزِ حیات ہے جو نسل، قومیت اور کلیسا کے بتوں کو توڑتا ہے۔ تسخیرِ کائنات کی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ روح کے گداز کا اہتمام بھی کرتا ہے اور انسان کو مشین بننے سے بچا لیتا ہے۔ آپ اس بات کو نہ بھولیے کہ اقبال اسلام کو دُکھی انسانیت کے لیے ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ایک باشعور شاعر اور دانشور کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسائل کو دوسری استیلا زدہ قوموں کے مسائل سے الگ نہیں دیکھتے ان کے نزدیک مغرب، استعمار و استیلا اور میکانکی تہذیب کا مظہر تھا اور مشرق انسان کی مظلومیت اور بیچارگی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ وہ اقوامِ مشرق کو جن میں اہلِ اسلام بھی شامل تھے ایک ہی مرض میں مبتلا پاتے تھے۔ اُن تمام لوگوں کو جو استحصال اور استیلا کا شکار تھے، اس بات کا شعور دلانے کے لیے انہوں نے جا بجا نعرہ حق بلند کیا۔

اقبالؒ نے اپنے وجدانِ شعری سے ایک سیاسی نصب العین کی اشاعت کا کام لیا اور اس کوشش میں اس روایت کو بھی بروئے کار لائے جو انہیں اپنے مذہب سے ملی تھی۔ لیکن اس سے ان کی شاعری جمود کا شکار نہ ہوئی بلکہ اس کا تاثر اب بھی اتنا ہی ہے جتنا اس وقت تھا جب جب ان کے فکر نے الفاظ کا رنگ اختیار کیا۔ اقبالؒ نے دنیا کے ہر گوشے کے مظلوم انسانوں کے لیے آواز اٹھائی۔ انہوں نے مظلوم اور غلام قوموں کی زبوں حالی پر نوحہ خوانی ہی نہیں کی بلکہ ان کی طرف سے نعرہ جہاد و انقلاب بھی بلند کیا اور مغربی استعمار کو اس طرح للکارا کہ ملک بہ ملک ساحل بہ ساحل بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ آج جب دنیا دو عظیم جنگوں کے بعد امن و صلح اور آزادی کی قدروں سے نسبتاً زیادہ روشناس ہونے کی کوشش

کر رہی ہے یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے غلام کدہ سے نصف صدی قبل اہلِ فرنگ کی حاکمیت کے خلاف نعرہ مستانہ بلند ہوا۔

؎ فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم، باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب، اے انقلاب!

اقبالؒ کو یقین تھا کہ مغرب کے مقابلے میں ایشیا ایک عظیم مستقبل کا مالک ہے انہوں نے ایشیا کی مظلوم و محکوم قوموں میں خود اعتمادی بیدار کرنے کے لیے عظمتِ ایشیا کا نعرہ بلند کیا اور کہا۔

؎ سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم
شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دیں ز خاک خاور است
رشکِ گردوں خاکِ پاک خاور است

اقبال نے عظمتِ ایشیا اور اس کی غلام قوموں کے استخلاص کا جو جواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بعد میں قیامِ پاکستان، انڈونیشیا اور دوسرے لاتعداد افروایشیائی ممالک کی آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اقبال کے فکر و شعر نے اسلامیانِ ہندوستان

کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ اس نے عالمِ عرب کو اتحاد کی دعوت دی۔ اس نے ایشیا کی مقہور و مظلوم قوموں کو آزادی اور خودداری کا پیغام دیا۔ یہ اس کے پیغام کی ہی تاثیر تھی کہ زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں، استعمار کے کاخ و ایوان کو آزادی کے شعلوں کی زبان نے چاٹ لیا اور استعمار کے گھنڈروں پر آزادی اور عظمتِ انسان کے نئے محل نمودار ہوئے۔ اپنے پیغام کی ہمہ گیری اور اثر کا اندازہ اقبال نے اِن الفاظ میں کیا تھا۔

پس از من شعرِ من خوانند و در یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(از جناب عطاء اللہ سجاد)

تصوّرِ اتحادِ اسلامی

علامہ اقبالؒ اتحادِ عالمِ اسلامی کے سید جمال الدین افغانی کی طرح زبردست علمبردار تھے انہوں نے اپنی شاعری سے برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کیا ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ جس کا صلہ ارضِ پاکستان کی صورت میں ہمیں ملا۔

وہ صرف برصغیر کے شاعر نہیں تھے بلکہ وہ عالمِ اسلام کے شاعر تھے انہوں نے مسلمانانِ عالم کو ایک قوم بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمان قوم اس تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ متحد نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں۔

؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

وہ چاہتے تھے کہ دنیا بھر کے سارے مسلمان رنگ و نسل، قومیت، علاقائیت اور فرقہ واریت کے اختلافات کو بھول کر عالمگیر اسلامی اتحاد کی خاطر ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ پوری اُمتِ مسلمہ ایک جان دو قالب ہو جائے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ دوبارہ حاصل کرے۔

؎ بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ان کا دل پوری امتِ مسلمہ کے لیے دھڑکتا تھا۔ وہ جمال الدین افغانی کی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ مسلمانوں کو ایک ایسی قوم کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جو اپنے آپ کو قومیت، نیشنلزم اور وطن پرستی کی چار دیواری میں قید نہ کرے۔ وہ سارے جہان کو اپنا گھر سمجھتے ہوں۔ جہاں جہاں مسلم آباد ہیں۔ وہ

مسلمانوں کا وطن ہو۔ ان کے نظریات آفاقی تھے۔

اتحاد اسلامی کی طرف تعمیر پاکستان ان کا پہلا قدم تھا۔ ان کی منزل پاکستان سے بھی آگے ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنا ان کا مشن تھا۔ انہوں نے تعمیر پاکستان سے اپنے مشن کا آغاز کیا اب ان کے اس مشن کو آگے لے کر چلنا ہمارا کام ہے۔

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

افغانستان کے مسلمانوں سے بھی ان کو دلی لگاؤ تھا۔ اور وہاں کے لوگوں میں اب بھی اقبالؒ زندہ ہیں۔ افغان کے مطابق وہ کہتے ہیں۔

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملتِ افغان در آں پیکر دل است

ایک دوسرے موقع پر افغانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

ملت آوارہ تن کوہ و دمن
در رگ او خون تیراں موجزن
زیرک و رو ئیں و روشن جبیں

علامہ اقبالؒ مسلم ممالک کی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام مسلم ایک قوم ہیں چاہے وہ عرب ہوں یا ایرانی یا افغانی وہ سب کو ایک سمجھتے ہیں۔ ایک اور جگہ افغانی مفکر مولانا جلال الدین سے اپنی عقیدت کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

مرشد او آں حکیم پاک زاد
سر مرگ و زندگی بر ما کشاد

علامہ اقبالؒ صرف برصغیر ہند و پاک کے نہیں بلکہ عالم اسلام کے شاعر تھے

وہ مسلمانوں پر مغربی تسلط کے مخالف تھے۔ وہ جا بجا مغرب کے اس تسلط کے خلاف آواز حریت بلند کرتے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے عظیم مفکر تھے وہ نہ صرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ اپنے کلام سے انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ وہ آدمی کو آدمی کا احترام سکھاتے ہیں۔ اخوت، محبت اور بھائی چارہ کی تلقین کرتے ہیں۔

میری زبان و قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
نہ ہو شکوہ کسی کو زیر آسماں مجھ سے
برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا وہ مشرق کے ترجمان تھے مگر مغربی علوم سے نابلد نہیں تھے۔ انہوں نے کئی مغربی اسکالرز پر ریسرچ کی تھی۔ انہوں نے یورپ کے فلسفۂ حیات کا بڑا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے سینٹ تھامس، ہیگل اور نیٹشے کو پڑھا تھا۔ اور ان کے مغربی فلسفہ کے مقابلے میں اپنا فلسفہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو بھی خودی کی تعلیم دی۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں خودی پیدا ہو جائے تو ایک بار پھر دنیا میں مسلمانوں کا وقار بلند ہو جائے گا۔ وہ دین و دنیا میں کامران و کامیاب ہوں گے۔

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے

خودی وہ جوہر ہے جس سے روشن انقلاب پیدا ہوتا ہے خودی کے سبب

انسان مشکلات میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے کلام کے ذریعہ مسلمانوں کو مایوسی نا امیدی اور یاس سے نکالتے ہیں ان کو عمل پیہم اور جد و جہد کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہمت اور حوصلہ سے کام لینے کو کہتے ہیں۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا!

آج ہم جس انتشار اور بے راہ رویوں کا شکار ہیں اس سے نجات کے لیے کلام اقبالؒ سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اگر قوم ان کے پیغام پر عمل کرے تو ہم ہر قسم کے بحران سے نکل سکتے ہیں اور ایک بار پھر دنیا میں مسلمانوں کا اور پاکستان کا وقار بلند کر سکتے ہیں۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

محمد اکرم قریشی

تصورِ ملّتِ اسلامیہ

علامہ[1] اقبال ملت اسلامیہ میں اس مقام کا سنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو مقام اس امت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اس عرفان کے بغیر انسان نہ خود شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا شناس فرمایا

یہی آدم ہے سلطان بحر و بر کا؟
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا!
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

وہ بچہ بے حد رنجیدہ ہیں کہ مسلمان اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ بشارت دی ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ[1] اس آیت شریفہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم انسانی کی قیادت و رہنمائی کے ذمہ داری بھی امتِ اسلامی پر عائد ہوتی ہے۔

میانِ اُمّتاں والا مقام است
کہ آن امت دو گیتی را امام است
نیا ساید نگارِ آفرینش
کہ خواب و خشگی بر دے حرام است

---

[1] استفادہ از اقبالیات جنوری مارچ ۱۹۸۸ مرتبہ پروفیسر محمد منور مقالہ علامہ اقبال اتحاد عالم اسلامی کے داعی نگارش ڈاکٹر عبداللہ طرازی ص ۹۴ - ۹۵

اِس قیادت کے بارِ گراں کو سنبھالنے کی ذمہ داری اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب مسلمان اپنی ذات اور اس کے امکانات سے واقف ہوں اور اس کی تربیت کے لیے آمادہ ہوں۔ تربیتِ نفس کے لیے علامہ اقبالؒ نے جدید اصطلاحات کے ذریعے جو نظامِ تربیت دیا ہے وہ اسلام کے نظام (تزکیۃ النفس) سے الگ کوئی اور چیز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا[1] اللہ تعالیٰ جس کسی کو چاہتے ہیں حکمت سے سرفراز فرماتے ہیں، اور جس کسی کو یہ حکمت عطا کی جاتی ہے۔ اس کو خیرِ کثیر عطا کیا جاتا ہے۔ یہ فضیلت اللہ کا انعام ہے خوش قسمت بندوں ہی کو عطا کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جن کو اس حکمت سے سرفراز کیا گیا ہے۔

حکمت کا یہ لفظ قرآن کریم میں جن معنوں میں آیا ہے

اس کے بارے میں ابنِ عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ، حکمت، معرفتِ قرآن ہے" مجاہد کا بیان ہے کہ "حکمت علم ہے، فقہ ہے، قرآن ہے" ابوالعالیہ کا کہنا ہے کہ "حکمت خشیت اللہ ہے" اور ابو مالک کا قول ہے "حکمت سنّت ہے" مگر امام مالکؒ جامعیّت کے ساتھ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں: "میرے دل میں آتا ہے کہ حکمت سے مراد تفقہ فی دین اللہ ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ امام مالکؒ کی رائے اوپر بیان کی ہوئی ساری تشریحوں کی جامع ہے۔ اس طرح علامہ اقبالؒ کے پاس یہ حکمتِ دین کی نعمت تھی جس پر انہوں نے تفقّہ کیا اور اپنے عصر کے مسائل کی تفہیم و تعبیر کی۔

---

[1] استفادہ از اقبالیات جنوری مارچ ۱۹۸۸ - مرتبہ پروفیسر مقالہ علامہ اقبال اتحاد اسلامی کے داعی نگاش ڈاکٹر عبداللہ لمرازی ص ۹۴ - ۹۵

اس اعتبار سے علامہ اقبالؒ، عالمِ اسلامی میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ان کے سوزِ جگر ان کی بحث و تحقیق اور ان ساری جدوجہد کا پس منظر یہی "حکمت" ہے۔ اور اس حکمت سے انہوں نے اُمّتِ مسلمہ کو مخاطب کیا ہے ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علم، حرف و صوت را شہپر دہد
پاکیِ گوہر بہ ناگوہر دہد

(پروفیسر محمد منور)

تصوّرِ مردِ کامل

اقبالؒ[1] کا مردِ کامل ارسطو اور نطشے کے مردِ کامل سے بالکل مختلف اور ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اقبالؒ کا مردِ مومن جلال و جمال کا مجموعہ ہے۔ اس پر قرآن مجید کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اقبالؒ خود ایک مفکرِ قرآن تھا اور وہ لوگ جنہوں نے علامہ اقبالؒ کو قرآن پاک کے مطالعہ میں محو دیکھا ہے، وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت اقبالؒ جب تلاوت کلام مجید کرتے تھے تو الفاظ کے معانی و مطالب ان پر اس طرح عیاں ہوتے تھے کہ خدائے ذوالجلال کے خوف سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برسنے لگتی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے مردِ مومن کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ قرآنی تعلیمات کا آئینہ دار ہے اور اس کا سراپا عین قرآن ہے

اقبال کا مردِ مومن عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اور جو عشق تابعِ عقل ہو اسے خام گردانتا ہے۔ وہ عشق جو مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے اور اپنے لختِ جگر کو اپنی آنکھوں کے سامنے رضائے خدا کی خاطر قربان کر دینے پر تل جاتا ہے۔ اقبالؒ کا مردِ مومن ایک ایسا با اصول انسان ہے جو انسانیت کے لیے باعثِ رحمت ہے اس کا کردار بھی انسانی بقاء کے لیے

---

[1] استفادہ از اقبال شناسی اور محور مؤلفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۱۵۲ از مقالہ مجاہد نقوی۔

ضروری ہو۔ وہ ایمان، یقین اور اخلاقِ حسنہ کا مجسمہ ہے۔ ذیل میں اقبالؒ کے کلام سے چند ایک شعر نقل کیے جاتے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اقبالؒ کے نزدیک مردِ مومن کے اخلاق و اطوار کیا ہیں جن سے اس کی شخصیت کا خمیر تیار ہوتا ہے۔

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبالؒ کا مردِ مومن کائنات کی رنگینیوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتا بلکہ خودی کے زور سے دنیا پر چھا جاتا ہے۔ وہ طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتا ہے اور یہی توحید ہے۔ اقبالؒ کا مردِ مومن، زندگی کے مسائل سے گھبراتا نہیں بلکہ ان کا مردانگی سے مقابلہ کرتا ہے اور اپنی راہ سے ہر کانٹے کو ہٹا دینے میں سرور محسوس کرتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن تمام مدارجِ ارتقاء طے کر چکنے کے باوجود، وجودِ حقیقی کے مقابلہ میں ناقص اور ناتمام ہی رہتا ہے اور کمال کا جلوہ اسے ذاتِ مطلق ہی میں نظر آتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن محبتِ رسولؐ اور عشقِ الٰہی میں سرشار اور مادیت سے مبرا ہے۔ اس کا ہر قدم اور ہر فعل سنتِ نبویؐ کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اس کا دل انوارِ الٰہی اور مشاہدۂ حق سے پُرنور ہوتا ہے اور وہ ماسوائے اللہ کی ذات کسی اور سے خوف نہیں کھاتا اس کی آواز میں دلبری بیباکی اور اثر و قوت ہوتی ہے۔ اس کے اندر جذبہ، تڑپ، سوز اور گرمی ہوتی ہے تجلیاتِ کے مشاہدہ سے اس کی تیرہ شبی روشن ہوتی ہے۔ اور انوار و برکات سے صبح فروغ پاتی ہے:۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبالؒ کا مردِ مومن حصولِ منفعت اور کسبِ زر سے بے نیاز ہوتا ہے وہ کسی بادشاہ و امیر کے دربار کی طرف رخ نہیں کرتا۔ اسے تخت و تاج کی کوئی پروا نہیں ہوتی، کیونکہ:۔

ع مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

مومن اپنے فقرِ غیور میں مست رہتا ہے۔ وہ دنیاوی حادثاتِ ارضی مشکلات کا گلہ مند نہیں۔ کیونکہ اس کا فقر غیرت مند ہوتا ہے خداوند تعالیٰ کی رزاقیت پر اسے کامل یقین ہوتا ہے وہ دنیاوی رنگینیوں میں گم نہیں ہوتا بلکہ دنیا اس میں کھوئی ہوتی ہے۔ اقبال مومن کی ایک پہچان یوں بیان کرتے ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبالؒ کا مردِ مومن رزم و بزم، ہر میدان کا شہ زور ہوتا ہے۔ اگر حلقۂ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے اور اگر حق و باطل کا معرکہ آن پڑے تو صورتِ فولاد بن جاتا ہے۔ وہ ہر طرف اللہ کی حکمرانی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے بادشاہت کی ضرورت ہوتی ہے نہ تخت و تاج سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

اقبالؒ بعض اوقات مردِ مومن کو شاہین اور باز سے بھی خطاب کرتا ہے۔ شاہین کبھی قوتِ عمل کو شش و سعی اور محنت و لگن سے نہیں گھبراتا اور نہ اس کی طبیعت میں آرام و سکون کی خواہش پیدا ہوتی ہے وہ مسلسل اونچی اڑان

رکھتا ہے اور ہمیشہ چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں کرتا
ہر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرہ افتاد

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبالؒ کا مردِ مومن احکام و قوانینِ اسلام کا پابند ہوتا ہے وہ ہمہ وقت معرفت الٰہی اور مشاہداتِ اسرارِ الٰہی میں سرشار ہوتا ہے اس کی ذات رب ذوالجلال کی ذات میں فنا ہوتی ہے۔ اس کی گفتار و رفتار، افعال و کردار اور مقصد و ارادہ منجانب اللہ سرزد ہوتے ہیں۔ طاقت خداوندی کی وہ مکمل تصور ہوتا ہے:

ع ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ

اقبالؒ نے مردِ مومن کا جو تصور پیش کیا ہے اگر انسان اسے اپنا لے تو پھر دنیا گہوارہ امن و سلامتی بن جائے۔ انسانیت سسک سسک کر دم نہ توڑے، خلوص کے سوتے کبھی خشک نہ ہوں۔ قربانی و ایثار کے اجلے اجلے دامن صدا بے شکن رہیں۔ بے مروتی اور نفرت پاش پاش ہو جائے کوئی کسی پر ظلم روا نہ رکھے۔ اگر اقبالؒ کے افکار و نظریات پر مبنی معاشرہ قائم ہو جائے تو تمام معاشرتی برائیاں ختم ہو جائیں اور تمام انسان اس زمینِ خدا پر بھائیوں کی طرح آرام و سکون کے ساتھ خوشگوار ماحول میں زندگی بسر کریں۔

(از جناب مجاہد نقوی)

تصورِ مردِ مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں، تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلؑ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

حضرت علامہ[1] اقبالؒ کے ان اشعار کی روشنی میں جب آپ دیدۂ بینا سے دیکھیں گے، تو آپ کو علامہ اقبالؒ کا وہ مردِ مومن صاف نظر آجائے گا جو تلاش میں پیر کہن سال و مہر نے ہزاروں گردشیں کاٹیں۔ لیلائے شب نے جس کی تمنائے وصال کے لیے اپنی مانگ میں ستاروں کے موتی بھرے۔ روزِ روشن نے جس کے استقبال کے لیے سورج کا سنہری تاج سر پر رکھا۔ پھولوں کی مہک میں اس کی خوشبو، بلبل کی چہک میں اس کے نغمے، گلوں کی شادابی میں اس کا حسن، جوئباروں میں اس کا

---

[1] استفادہ از انداز بیان مولفہ عبداللہ شاکر ص ۱۰۲

ترنّم، کوہساروں میں اس کی ہیبت، شفق کی سرخی میں اس کا لہو، ہوا کے فراٹوں میں اس کی یلغار، فضا کے سناٹوں میں اس کا سکوت، دریا کی طغیانی میں اس کی جولانی اور سمندر کی لہروں میں اس کی جوانی دیکھی ہے!

اقبالؒ کا مردِ مومن زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے والا، جہانِ کہنہ کو زیر و زبر کرنے والا، گردشِ دوراں کی طنابیں کھینچنے والا، اشہبِ زمانہ کو چابک رسید کرنے والا، آسمان کی ردائے کہنہ کو تار تار کرنے والا اور جبرئیل کو صیدِ زبوں سمجھ کر شکار کرنے والا ہوتا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ

اقبالؒ کا مردِ مومن محبت کی تصویر، وفا و مہر کی تنویر، یوسفؑ صدیق کے خواب کی تعبیر، اور خالدؓ کی شمشیرِ بے نیام ہوتا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے، مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبرئیل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اقبالؒ کا مردِ مومن انقلاب کا اسرافیل ہوتا ہے، کبھی اس کی تیغِ خارا شگاف کی ضرب سے کہساروں کا زہرہ آب ہو جاتا ہے، کبھی اس کی یلغار کی ہیبت سے دشت و جبل کانپ اٹھتے ہیں اور کبھی اس کے تیور دیکھ کر چرخِ نیلی فام کا رنگ فق ہو جاتا ہے ؎

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اقبالؒ کا مردِ مومن تاریخ کا نقشہ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ کر وحدتِ الٰہ، وحدتِ قوم اور وحدتِ فکر کا ایک ایسا جہان آباد کرتا ہے جس میں محبت کے سوتے اُبلتے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ الفت اور پیار کی ندیاں گیت گاتی اور وفا کی کہانیاں سناتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ دنیا کو اس کے دم قدم سے سکون و اطمینان کی دولت میسر آجاتی ہے اور خوف و ہراس کے مہیب سائے دُم دبا کر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور زندگی اطمینان کا سانس لیتی ہے اور منزل کی طرف گامزن رہتی ہے۔

مردِ مومن کا انقلاب عروسِ ہستی کی زلفوں میں محبت کے موتی پرو دیتا ہے۔ رات کی رانی کی مانگ چاند تاروں سے بھر دیتا ہے، صبح کی سپیدی میں تقدیسِ الٰہ کی اذانوں کے نغمے گوندھ دیتا ہے۔ گویا کہ وہ تمام کائنات کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے۔

مزدور اور کارخانہ دار ایک دوسرے کے لیے آغوشِ الفت کھول دیتے ہیں۔ مالک اور مزارعِ محبت کے زمزم سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں، غریب اور امیر گلے ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں صف بستہ نظر آتے ہیں۔

مردِ مومن کی حکومت رحمتِ یزدانی، ظلِ سبحانی ہوتی ہے اس کی عدالت عدلِ فاروقی کی علمبردار ہوتی ہے۔ اس کا صدق صدیقِ اکبرؓ کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کی غنا عثمانِ غنیؓ کو جنم دیتی ہے اور اس کی تلوار ذوالفقارِ حیدرِ کرار کی طرح زمانے سے فتح کا خراج وصول کرتی ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

کفر کے ایوانوں میں اس کے دم سے زلزلہ، جبّاروں اور قہاروں کو اس کی نگاہِ تازیانہ فرعونوں اور ہامانوں کے لیے اس کا وجود قہرِ الٰہی اور خداوندانِ باطل کے لیے اس کی ہستی ابراہیم علیہ السلام کا تبر بن کر برستی ہے اور ان کے نجس وجود کو پاس کر کے رکھ دیتی ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں

مردِ مومن جب خودی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے، تو اس کا وجود ارض و سما کی وسعتوں کو محیط ہو جاتا ہے اور خدا خود اس سے پوچھتا ہے ع

بتا تیری رضا کیا ہے ؟

مردِ مومن فی الحقیقت خودی کے گوہرِ تابدار سے ہی یگانۂ روزگار بنتا ہے اسی لیے اسے ہدایت کی گئی ہے ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سِرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اسے اس کے بلند مقام سے آگاہ کرتے ہوئے حکیم الامت فرماتے ہیں ؎

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

(عبداللہ شاکر)

تصورِ حریتِ فکر و عمل

علامہ اقبالؒ کے کلام پر مجموعی طور پر غور کریں تو ایک مسلسل مکالمے کا تاثر ہوتا ہے۔ کہیں خدا اور انسان مصروفِ گفتگو ہیں۔ کہیں فرشتے اور ابلیس کا مکالمہ تو کہیں شاعر اپنی قوم سے خطاب کر رہا ہے۔ اکثر فریقِ ثانی، مثلاً قوم یا مسلمان یا تاریخ خاموش رہتے ہیں اور مہیم سوال بنے رہتے ہیں اور شاعر ان کا جواب دیتا ہے یا خضر اور پیر رومی سے حاصل کرتا ہے۔ خدا انسان، کائنات، تاریخ، قوم، یہ ہیں وہ عظیم حقائق جس سے صرف ایک عظیم شاعر ہی ادب کی تخلیق کر سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کا مشاہدہ بھی یہی تھا کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے لیکن ساری دنیا میں وہ پابہ زنجیر اور ذلیل و خوار ہے کہیں انسان انسان کا تابع ہے تو کہیں اپنے نفس کا غلام ہے۔ کہیں وہ خود ساختہ نظام کے تلے دبا ہوا ہے تو کہیں اپنی خودی کو فراموش کر کے زمانے کی گردش کے پیدا کردہ جھوٹے مذاہب کا اسیر ہے۔ ہر سو غلامی کے سائے دیکھ کر اقبالؒ آزادی حاصل کرنے کے لیے عمل مسلسل کی دعوت دیتا ہے لیکن عمل ایک غلام کے لیے ناممکن ہے۔ خاص طور سے اگر غلام زنجیروں سے مانوس ہو کر پرواز کے امکان کو ہی بھول چکا ہو۔ اس لیے اقبالؒ عمل کے امکان کو خودی کی شناخت سے مشروط کرتا ہے۔ اقبالؒ کے لیے زندگی حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔ لیکن یہ جدوجہد صحیح معنی میں اسی کے لیے ممکن ہے جو اپنی خودی کو پا چکا ہو۔

اقبالؒ کا تصورِ خودی اس نفس مستعار سے جدا تھا جو کہ حوادثِ زمانہ اور اور معاشرتی دباؤ کے تحت انسان کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ خودی دراصل انسان کا وہ نفس حقیقی ہے جو اپنے رب، خالقِ کائنات کو پہچانتا ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ خدا نے تمام نسلِ انسانی سے اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے سوال کیا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" اور انہوں نے اقرار کیا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" (سورہ اعراف، آیت ۱۷۲)

— حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والی پوری نسلِ آدم کو خدا نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی (تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۹۴ — حدیث کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے "ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں اپنے آپ اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کیا۔ ضرور ہمارے رب ہیں تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔"

خودی میں ڈوب کر انسان اپنی اصل کو پہچانتا ہے خودی کا اقرار دراصل اپنی بندگی کا اقرار ہے۔ ایک ایسا اقرار جو کہ تمام دنیاوی آقاؤں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے خودی کو پہچاننے پر انسان فطری طور پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی تصدیق کرتا ہے تیغِ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ خودی کا یہ تصور اقبالؒ کی نظر میں ایمان اور عمل کو باہم مربوط کر دیتا ہے — خودی انسان کو اس ازلی پیمان کی یاد دلاتی ہے جو انسان نے خدا کے ساتھ کیا تھا۔ انسان اپنے خدا کو پہچان لے تو راز کائنات سے واقف ہو جاتا ہے اور یہ بامعنی عمل کی ابتدا ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
سبک اسکے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

حریتِ فکر و عمل کے لیے کلام میں انفرادی خوبیوں پر زور دیا گیا ہے۔ نفس کا غلام اقبالؒ کی نظر میں بندۂ آزاد نہیں ہو سکتا۔ مردِ حُر کے لیے قلندر ہونا ضروری ہے۔ کلام اقبالؒ میں قلندر کی دو خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ عشق اور فقر۔ عشق خدا کے ساتھ اس کے تعلق کا نام ہے۔ ساتھ ہی عشق اس کیفیت کا بھی نام ہے جو انسان کو دنیا میں ایک خاص مقصدِ حیات سے وابستہ کر دیتی ہے عشق کے ساتھ فقر بھی قلندر کی نشانیوں میں سے ہے۔ اقبالؒ افلاس سے پیدا ہونے والے فقر اور خود قبول کردہ فقر میں تمیز کرتا ہے اس کا تصورِ فقر حدیثِ نبوی "فقر فخری" پر مبنی ہے۔ فقر ایک روحانی کیفیت ہے جو کہ دنیا کے سامانِ عیش اور دولت کی حرص سے آزاد

ہو کر ہی حاصل ہو سکتا ہے یہ محض زہد کا نام نہیں ہے بلکہ خودی کا فاتحانہ مظہر ہے جو کہ قلندر کو جہاد کے قابل بنا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مجاہد کو جو صرف عشقِ حقیقی کی خاطر راہِ جہاد میں نکلا ہو۔ دنیاوی قوت کے ذریعہ دبایا نہیں جا سکتا۔

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری !
اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری !
اِک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اِک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

خودی، عشق اور فقر۔ یہ ہیں اس باعمل اور متحرک شخصیت کی کیفیات جو کہ اقبالؒ کے کلام کا ہیرو ہے۔ یہ شخصیت چٹانوں کو کاٹ کر جوئے شیر نکالتی ہے اور ستاروں پر کمند ڈالتی ہے۔ اسکی حیات جہادِ مسلسل ہے اور اس جہاد کا مقصد معرفتِ حق ہے۔ خودی، عشق اور فقر۔ ان کا ظہور تاریخ ساز انسانوں میں ہوتا ہے۔ اقبالؒ کی نظر میں انسانیت کے ہیرو ابراہیمؑ اور حسینؓ ہیں۔ خودی عشق اور فقر نے انہیں نفس کے پھندوں سے آزاد کر دیا تھا اور انہوں نے باطل نظام کو بے خوف اور بلا جھجک للکارا تھا کیونکہ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی !

یہ خوبیاں بدرجہ اتم مومنِ کامل یعنی رسول اللہ محمدؐ میں موجود تھیں۔ اور رسولِ کریمؐ کی چھوڑی ہوئی قدریں ہر زمانے کے مجاہدین اور صالحین کی جدوجہد میں نظر آتی ہیں۔

آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ صدق و یقیں

خلقِ عظیم کے لیے دیکھیں قرآن پاک: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔ سورۃ القلم آیت ۴)

اقبالؒ کی فکر میں جبریت کے فلسفے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تاریخ ایک اندھا تواتر نہیں۔ نہ یہ ایک مسلسل ارتقاء کا نام ہے۔ انسان کی کہانی دراصل حق و باطل کی کشمکش کی داستان

ہے۔ تاریخ زبان سے کہتی ہے کہ انسان "اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے"۔ جنت اور جہنم انسان کے لیے مقدر نہیں بلکہ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"۔ انسان محض اک "انگارۂ خاکی" ہے لیکن ایمان اور یقین اسے خدا کا نائب بنا دیتے ہیں۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اقبالؒ کی پوری فکر کا مواد ابتدائی شکل میں موجود ہے فلسفۂ عمل و جہاد شہادت کا نظریہ، عشق کا مطلب، مردِ مومن کی حقیقت، سب یہاں موجود ہیں۔

ایمان اور یقین جب خودی کو بیدار کرتے ہیں اور عمل کی دنیا میں انسان عشق کی منزلوں سے گذرتا ہے اور فقر کو اپناتا ہے تو وہ بندۂ آزاد بن کر جیتا ہے۔ مردِ مومن کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ ایک تاریخ ساز قوت اس کے ارادوں میں پنہاں ہوتی ہے پھر ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ وہ بندگی میں اللہ کی قدرت کے ساتھ اس حد تک یکساں ہو جاتا ہے کہ اللہ کی تقدیر بندے کی تدبیر میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا انسان ناقابلِ شکست ہے۔ خدا کا نائب اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس کی خودی اور اس کا وجود خدا کے احکام کا جیتا جاگتا ثبوت بن جاتا ہے اور وہ بندۂ مومن قرآن ناطق کہلاتا ہے۔

ان لوگوں نے اقبالؒ کو غلط سمجھا جو کہتے ہیں کہ اقبالؒ کسی سیکولر انقلاب کا یا مارکسی انقلاب کا حامی تھا۔ "لینن خدا کے حضور میں" اور "فرمانِ خدا"، اقبال کی مجموعی فکر سے الگ اجزاء نہیں ہیں بلکہ اس کے تصورِ حریت و عمل کا فطری نتیجہ ہیں۔ اقبالؒ کو اس امر کا پورا علم تھا کہ بامعنی انقلاب اگر کوئی ہے تو وہ اسلامی انقلاب ہی ہو سکتا ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سیکولر انقلاب تو تبدیلیِ زنجیر کے سوا کچھ نہیں۔ جو افراد اپنے وجود کو نفس اور زمانے اور طاغوت کی غلامی سے آزاد نہ کر سکتے ہوں وہ دنیا کو نیا نظامِ حیات تعمیر کرنے میں کیسے مدد دے

سکتے ہیں۔ حقیقی انقلاب تو عشاق ہی برپا کر سکتے ہیں جن کا خواب اقبالؒ نے "شکوہ" کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بیسویں صدی کے اندھیروں میں چراغ مصطفویؐ کے بغیر انسانیت کے لیے بھٹکتے رہنا مقدر ہے۔ تبدیلی اگر آسکتی ہے تو قلندروں کی بے خوف اجتماعی قوت سے ہی آسکتی ہے۔

"مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ فقر بوذرؓ صدق سلمانیؓ!"

آزادیٔ فکر عمل حق کے سرچشمہ سے ہی خودی میں ڈوب کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہی اقبالؒ کا وجدان ہے۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے

(پروفیسر کوکب صدیق)

تصورِ وجود زن

علامہ اقبالؒ نے برصغیر میں آباد اُمّت مسلم کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ستاروں پر کمند ڈالنے اور ایمان کی قوت سے تقدیریں بدل دینے کا سبق دیا ہے۔ انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے ہر طبقے کو بیدار کر کے تعمیر اسلامی کے علمبردار بننے کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ بات یاد دلائی ہے کہ۔

ع

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ان عناصر سے بننے والے مسلمان کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ وہ بے تیغ بھی لڑتا ہے۔ اس کے اشارۂ چشم و ابرو سے سمندر ہل جاتے ہیں اور طوفان تھم جاتے ہیں۔ اسی مفکرِ فطرت علامہ اقبالؒ نے عورت کے بارے میں بھی اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ع وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز و دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے شدتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دوج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

یہ اشعار عورت کی غیر معمولی اہمیت اور نسلِ انسانی میں اس کی حسین مرکزیت کا اظہار

استفادہ از اسلام کی عالمی ثقافت از ام فاروق ص ۱۴۶

کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا کے مختلف دانشوروں اور فلاسفروں کے درمیان عورت کا وجود متنازعہ رہا ہے۔ بعض لوگ اسے شیطان کے آنے کا راستہ بتاتے رہے ہیں۔ بعض نے اس سے بچ نکلنے کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا۔ بعض مذاہب نے تو اس سے دور رہنے کو روحانیت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔

اصل میں یہ ساری باتیں افراط و تفریط کی باتیں ہیں۔ اس افراط تفریط سے بچنے کے لیے مسلمان کو سکھایا گیا ہے۔ کہ وہ پانچوں نمازوں میں اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کرتا رہے کیونکہ سیدھا راستہ وہی ہے جو اسلام نے سکھایا ہے اور ہادی برحق محمدؐ نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ ہمیں اسلام نے یہ بتایا ہے کہ عورت اور مرد انسانی زندگی میں دو رفیق ہیں دونوں ساتھی ہیں۔ دونوں انسان ہیں۔ دونوں کی اصل ایک ہے اور ان دونوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

قرآن نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۝

"اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔" (سورۃ النساء)

گویا عورت اور مرد ایک ہی چشمے کی دو موجیں ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ کائنات کی رعنائی اور خوبصورتی میں عورت کے وجود نے غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد فراموش نہیں کیا جا سکتا جب آپ نے فرمایا "مجھے دنیا کی چیزوں میں تین چیزیں بہت پسند ہیں۔ خوشبو۔ عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔" جب ہم ان تینوں چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ تو ان میں نماز تو بندے اور خدا کے درمیان ایک روحانی تعلق ہے۔ خوشبو ایک غیر مادی چیز ہے۔ صرف عورت کا وجود ہی ایک مادی موجود ہے جو دنیا میں رونق۔ آبادی اور افزائش کا ذریعہ ہے۔ عورت پوری انسانیت کی ماں ہے۔ اس کے بغیر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دنیا چار دن بھی چل سکتی ہے

چنانچہ حضور اکرمؐ نے یہ فرما کر عورت کو انتہائی اعزاز عطا فرمایا کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے" ایک صحابی نے جب حضورؐ سے پوچھا کہ سب سے زیادہ قابلِ احترام اور حق دار کون ہے تو حضورؐ نے فرمایا، "تمہاری ماں"۔ صحابی نے دوبارہ پوچھا کہ ماں کے بعد کون اس پر رسول اللہؐ نے دہرایا کہ "تمہاری ماں"، اس طرح تین بار ماں کا حق بیان کرنے کے بعد پھر حضورؐ نے باپ کا حق بیان فرمایا۔

حضورؐ نے بیویوں کے حقوق کے بارے میں فرمایا کہ "تم میں سے بہتر وہ لوگ ہیں۔ جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں"، ایک دوسرے موقع پر فرمایا "ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا"، اس کے بعد تاکید فرمائی کہ "کسی مسلمان کو اپنی بیوی سے نفرت ہرگز نہیں کرنا چاہیئے"، رسول اکرمؐ نے اپنے یادگار خطبہ حجۃ الوداع میں بڑی تفصیل سے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا" اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو، بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج جو اسلام سے پہلے تھا اس کی سخت مذمت کی گئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ چاہیں رسول اکرمؐ نے بیٹوں سے ترجیحی سلوک کرنے کی ہدایت کی "جب تم اپنے بچوں میں کوئی چیز تقسیم کرنے کے لیے لاؤ تو بیٹوں سے شروع کرو۔ کیونکہ بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں"۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "جس کے کوئی بیٹی ہو اور وہ اس کے ساتھ منصفانہ سلوک کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا"۔

علامہ اقبال نے اپنی مشہور کتاب "اسلام کی تذہبی فکر کی تشکیل جدید"، کے صفحہ ۱۶۱ پر لکھا ہے "وراثت میں عورتوں کی قانونی حصہ داری میں جو بظاہر عدم مساوات نظر آتی ہے۔ وہ لڑکی کی کسی فطری کمتری کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معاشی مواقع کے پیشِ نظر ہے اور اس مقام کی وجہ سے ہے جو اسے معاشرے کے نظام میں حاصل ہے محمڈن لا کے مطابق لڑکی اس جائداد کی پوری طرح مالک تصور کی گئی ہے جو اسکو شادی کے

وقت باپ کی طرف سے ملتی ہے اور پھر شوہر کی طرف سے بھی۔ اس کے علاوہ مہر بھی کلیتہً اسی کی ملکیت ہوتا ہے اور مہر کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی ساری جائداد اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ساری عمر کی کفالت بھی شوہر کے ذمے ہے۔ اس نکتہ نظر سے قانون وراثت میں بیٹے اور بیٹی کے معاشی مرتبے میں کوئی تفاوت نظر نہیں آتا۔"

علامہ اقبالؒ کے یہ ارشادات قرآن وسنت کی روشنی میں ہیں اور ان سے ان لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہیئے جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت نے بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کا آدھا حصہ مقرر کر کے عورت کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بیٹا ایک طرف سے اور بیٹی دو طرف سے وراثت میں حصہ پاتی ہے اور اس طرح بیٹا بیٹی شادی کے بعد حصوں میں برابر ہو جاتے ہیں۔

خدا اور رسولؐ کے ان ارشادات سے انسانی معاشرے میں عورت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اصل میں یہی اہمیت تصور کائنات میں اس کی رنگ و بو کی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج دنیا میں تزئین و آرائش حسن و خوبی کا بیشتر حصہ عورت کے وجود کا مرہونِ منت ہے۔ آبادیوں کی رونقیں کس کے وجود سے ہیں۔ گھروں میں چہچہاتے اور کھلکھلاتے معصوم بچے۔ نرسریوں میں پھولوں جیسے اطفال۔ کھیل کے میدانوں میں جواں سال کھلاڑی۔ کس کے دم قدم سے ہیں۔ بازاروں کی رونقیں۔ خوبصورت اور ریشمی کپڑوں کے ڈھیر۔ ہزارہا۔ نوع بہ نوع ڈیزائن کس کی خاطر ہیں۔ رنگ برنگ کی خوشبوئیں دیدہ زیب گوٹے کناریاں کس کے وجود کے لیے ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں عورت کی پسند اور ضرورت کا حصہ بہت زیادہ ہے اور وہ حصہ خوبصورت، قیمتی اور نفیس بھی ہے۔

یہ بات درست ہی ہے کہ تصویر کائنات میں رنگ و حسن عورت کے وجود سے ہے۔ ذرا دیکھئے کہ دنیا جہاں کے ادب میں ہوشربا کہانیوں کا موضوع کون ہے غور فرمائیے کہ دنیا بھر کے شعرا کے ہاں عنوانِ سخن کون ہے؟ فلسفیوں نے کس کے وجود کے بارے میں کیا کیا کچھ نہیں کہا ہے۔ اس کا پہلا شرف کیا کم ہے کہ

؎ مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

یہ دیکھئے کہ کس کے بگاڑ سے قومیں بگڑ جاتی ہیں۔ کس کی معاشرت کی تباہی سے قوموں میں انتشارِ فکر و عمل پیدا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

؎ اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت عورت رہ کر ہی مقاصد فطرت کو پورا کر سکتی ہے۔ اس کائنات کی ضرورت بھی یہی ہے کہ عورت عورت بن کر رہے۔ اسی صورت میں وہ کائنات کی تصویر میں رنگ و خوبی کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی نسائیت کو قربان کر کے مرد بننے کی کوشش کرے تو مقصدِ تخلیق بھی ناکام ہوتا ہے اور حسنِ و خوبی کائنات کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لیے شاعر مشرق نے کہا تھا۔

؎ جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اسی لیے ایک مشہور دانائے فرنگ میکلور نے کہا تھا کہ "ایک مرد کو تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن ایک عورت کو تعلیم دے کر آپ ایک خاندان کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔"

ایک دوسرے دانا برولڈ نے کہا "عورت مصیبت اور غم کو کم کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔"

ایک اور فلسفی تھیلز (Thales) نے کہا "باعصمت خاتون خدائے قدوس کی

صفت کاملہ کا پیش بہا نمونہ۔ فرشتوں کی حقیقی شان و شوکت۔ زمین کا نادر معجزہ اور دینا کی عجیب ترین چیز ہے۔" دورِ حاضر میں عورت کے مقام کو نظامِ باطل نے بے حد نقصان پہنچایا ہے اس لیے کہ یہ نظام انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس باطل نظام کا سب سے بڑا نقصان عورت کو ہی پہنچا ہے۔ اس کا گھر اس سے چھن گیا ہے جو اس کا قلعہ تھا۔ اس کی حفاظت کا اہتمام اس دور نے ختم کر دیا ہے۔ اس کا تقدس پامال اور اس کی عظمت نڈھال ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے کائنات کی تصویر میں حسن و خوبی کا جو رنگ تھا وہ خون بن کر رہ گیا ہے۔ عورت اس دردناک صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے کہ۔

؎ نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں

ایسی دردناک صورتِ حال میں پھر ہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

؎ نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ھو میں

(ام فاروق)

تصورِ محبت

عروسِ شب کی زلفیں ابھی ناآشنا خم سے ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پستانِ عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے
سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سی مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہ و سنبل نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
جرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے چمک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

(علامہ اقبال)

لہ استفادہ از بانگ درا ص ۱۱۱ مولفہ علامہ اقبال۔

تصورِ نسائیت

ڈاکٹر محمد اقبال[1] اور سیّد امجد علی انگلستان میں مقیم تھے، ایک دن ڈاکٹر صاحب لندن کی مشہور دکان سیلف ریجس SELFRIDGES پر ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے گئے اور سیلز گرل سے جرابیں دکھانے کو کہا۔ وہ لڑکی تیزی کے ساتھ سامان لینے کے لیے چلی گئی جب واپس آئی تو ڈاکٹر صاحب پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی وہ یہ تک بھول گئے کہ یہاں کیوں آئے ہیں، کہاں کھڑے ہیں اور لڑکی کو انہیں نے آرڈر دیا ہے سیلز گرل جب چیزیں لے کر ان کے سامنے پہنچی، تو ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں کس لیے کھڑی ہو"؟

لڑکی یہ سن کر آب دیدہ ہو گئی، ڈاکٹر اقبال کی باتوں میں اسے غم خواری اور ہمدردی کی جھلک نظر آئی اور غم خوار اور ہمدرد کے سامنے ہر کوئی اپنا دکھ درد بیان کرنے کے لیے بیتاب رہتا ہے، لڑکی بولی۔ میرے والدین کی آمدنی بہت ہی کم ہے، اس آمدنی میں وہ میری کفالت نہیں کر سکتے۔ اس لیے مجھے اپنی اور گھر کی ضروریات کے لیے نوکری کرنا پڑتی ہے۔

سیّد امجد علی نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس لڑکی سے یہ سوال کیوں کیا؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ اس خاتون کو تو کسی گھر کی روشنی بننا تھا۔ اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر، جرابیں فروخت کرنا تو نہیں تھا۔

(رفیق وحید الدین)

---

[1] استفادہ از روزگار فقیر مرتبہ فقیر سید وحید الدین ص ۱۲۷

تصورِ مخلوط تعلیم

صنفِ نازک کے بارے میں ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ نظریہ تھا کہ خواتین کا کام گھروں میں رہ کر نئی نسل کو تربیت دینا ہے کہ اس طرح معاشرے میں اعتدال و سکون قائم رہ سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب عورت کو "شمع انجمن" نہیں "چراغ خانہ" دیکھنا چاہتے تھے، ان کے سامنے یورپ کی زندگی تھی کہ عورت نے وہاں جب سے گھریلو ذمہ داری، تدبیرِ منزل اور خانہ داری کو خیرباد کہا ہے، یورپ کا معاشرہ تباہ و ابتر ہو کر رہ گیا ہے اور گھریلو زندگیاں بے مزہ اور بے سکون ہو گئی ہیں — ایک دن بیگم راس مسعود نے قدرے شکایت کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مرد خود تو تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لیے رقص و سرود کی محفلوں اور کلب گھروں میں چلے جاتے ہیں، لیکن بیچاری عورتوں کو چہار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے نہایت ہی متین لہجہ میں کہا، میں جو کچھ کہتا ہوں، اس میں تمام تر خواتین کا ہی فائدہ ہے، سفر افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا گیا کہ جب قرآنِ کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے، تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کے جواب میں فرمایا بے شک قرآنِ کریم میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے، لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں۔

پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح

تھے اور وہ اپنے اس موقف سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی بچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی کوشش اور جد و جہد کے بعد علی گڑھ سے ایک معلمہ بلوائی، جس نے گھر میں رہ کر ڈاکٹر صاحب کی بچی کو تعلیم دی۔

ڈاکٹر صاحبؒ منطقی اور فلسفیانہ انداز میں مردوں اور عورتوں کو ایسے مختلف خوشرنگ اور مہکتے پھولوں سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ جن کو پروان چڑھانے کے لیے جداگانہ اقسام کی کھاد درکار ہوتی ہے۔ وہ زن و مرد کی ترقی، نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے جداگانہ میدانِ عمل کے قائل تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ اور فرائض کے اعتبار سے بھی! فولاد اور پھول کی ڈالی سے ایک جیسا کام نہیں لیا جا سکتا۔

اب جو مخلوط تعلیم اور حجاب و بے حجابی کا ذکر چھڑ گیا ہے، تو اس ضمن میں ایک واقعہ کا بیان کرنا نہ صرف یہ کہ دلچسپی کا باعث ہوگا بلکہ اس کا ذکر نہایت ضروری ہے یہ واقعہ ڈاکٹر اقبال کے خیالات و نظریات کا آئینہ دار ہے کہ وہ صنفِ نازک کو زندگی کی منزل میں کن خطوط پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے اور عورت کے عصمت و آبرو کا تحفظ اُن کو کتنا عزیز تھا۔

حکومتِ افغانستان نے بعض مذہبی اور تعلیمی امور میں صلاح و مشورت کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد اقبال اور سر راس مسعود کو اپنے یہاں آنے کی جب دعوت دی، تو سر راس مسعود کی شادی کو بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ بیگم راس مسعود نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ اس سفر میں ان کے ہمراہ چلنا چاہتی ہیں، سر راس مسعود کے لیے بیوی کی ازمائش کا ٹالنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر اقبالؒ سے مشورہ ضروری تھا۔

لیکن جب ڈاکٹر اقبالؒ سے مشورہ لیا گیا تو انہوں نے لکھا

"حکومت افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و تربیت

کے لیے ہندوستان کے علماء کا وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بارے میں تعلیم کے خیالات و نظریات پر ان کا اعتبار باقی نہ رہے گا جس اعتماد کی بناء پر یہ آئمہ بلایا گیا ہے۔ چنانچہ بیگم سر راس مسعود وفد کے ہمراہ نہ جا سکیں

(فقیر وحید الدین)

تصوّرِ عشق

اقبالؒ[1] کے ہاں عقل کی تنقید کا مضمون اکثر عشق کی توصیف کے دوش بدوش چلتا ہے اور جا بجا بعض اوقات ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں کہیں کہیں مسلسل اشعار میں ان کا موازنہ اور مقابلہ ملتا ہے۔ عقل کی تنقید تو اکثر پڑھنے والوں کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے۔ لیکن عشق سے اقبالؒ کیا مراد لیتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے زیادہ غور و فکر درکار ہے۔ مسلمانوں کے ہاں صدیوں سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں زبان زد عام ہے۔ عشق حقیقی سے بعض اوقات انسانوں کی باہمی بے لوث محبت مراد ہوتی ہے۔ جس میں خود غرضی نفسانیت یا جنسیت کا کوئی شائبہ نہ ہو اور بعض اوقات اس کے معنی عشق الٰہی ہوتے ہیں یعنی اشخاص و اشیاء کی محبت کے ماورائے خدا کا عشق اور یہ عشق حقیقی دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا دل ہر قسم کی حرص و ہوس سے پاک ہو جائے۔

سرمدِ عشق بوالہوس را ندہند
سوز دل پروانہ مگس را ندہند

اقبالؒ نے عشق کے مفہوم میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت پیدا کر دی ہے اور اس بارے میں وہ خاص طور پر عارف رومی کا شاگرد رشید ہے۔ اقبالؒ نے حکمت و عرفان کے بیش بہا جواہر اسی مرشد سے حاصل کئے ہیں۔

---

[1] استفادہ از فکر اقبال مولفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۴۳۔

لیکن عشق کے بارے میں وہ خاص طور پر رومی کا ہم آہنگ ہے۔ رومی کے ہاں حکمت و علم بہت ہے اور عقل کی تعریف میں بھی اس کے نہایت بلیغ اشعار ملتے ہیں، لیکن رومی جہاں عقل سے عشق کی طرف آتا ہے وہاں عجیب ولولہ اور جوش دکھائی دیتا ہے۔ ایک لحاظ سے تمام مثنوی معنوی کا موضوع عشق ہی ہے۔ مثنوی کے تمہیدی اشعار میں بھی وہ عشق ہی کو بیان کرنا چاہتا ہے لیکن فوراً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔

گرچہ تفسیر و بیاں روشن گر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت
شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

عارف رومی کے نزدیک دین کا جوہر بھی عشق ہی ہے۔ ادیان میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے اور عقائد و شعائر و اعمال میں بہت کچھ فرق پایا جاتا ہے لیکن جب کسی شخص میں عشق حقیقی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ان امتیازات کی زیادہ اہمیت نہیں سمجھتا اور یہ کہہ اٹھتا ہے کہ۔

مذہب عشق از ہمہ دیں ہا جداست

چونکہ ظواہر ہی کو لوگ دین سمجھتے ہیں، جن کی حقیقت عاشق کے نزدیک ثانوی رہ جاتی ہے اس لیے عوام ہی نہیں بلکہ فقہا بھی عاشقوں کو کافر کہنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ عشاق خود بھی اپنے لیے کفر کی اصطلاح استعمال کرنے لگتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

میر کہتا ہے:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

عام لوگوں کو جو کچھ دین کے ظواہر و شعائر و عبادات سے حاصل ہوتا ہے، عشاق الٰہی کے نزدیک وہ سطحی اور ناپائدار ہوتا ہے۔ عشق تمام امراض ظاہری و باطنی کا علاج ہے۔

اے دوائے جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

جس عشق کی مدح سرائی حکما اور صوفیہ اور شعرائے متصوفین نے کی ہے، اس کے دو پہلو ہیں ایک تاثراتی یا جذباتی اور دوسرا نظریاتی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے جدا بھی ہو سکتے ہیں اور باہم مخلوط بھی ہوتے ہیں۔ جن حکما کا میدان فقط عقلیت ہے ان کے ہاں اس چیز کے متعلق نظریات ہیں جسے انہوں نے مشاہدۂ کائنات و حیات سے مدد لے کر استدلال سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے ان کے مقابلے میں ایسے صوفیہ بھی ملتے ہیں جن کے ہاں عشق کی کیفیت بڑے جوش و خروش کے ساتھ موجود ہے، لیکن وہ اس کی عقلی توجیہ کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ کیفیت ان سے دوسروں کی طرف برکت، صحبت اور فیض روحانی سے کم و بیش منتقل ہوتی ہے۔ راہ استدلال تو دراز اور پیچ در پیچ ہے اور تسکین آفرین بھی نہیں، لیکن لبریز عشق عاشق کی توجہ ایک لمحہ میں مستفیض انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ تصوف کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شخص کسی عاشق الٰہی کی نظر کیمیا اثر سے ایسا بدلا کہ اس کے عمر بھر کے ساتھی اس کو کوئی دوسرا ہی انسان سمجھنے لگے۔ قبل فیضان اور بعد فیضان کی زندگی میں کوئی مشابہت نہ رہی۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

تصورِ عصائے کلیمی

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اسلامی انقلاب ہو یا طاغوتی نظام دونوں طاقت کے بل بوتے پر قائم ہوتے ہیں۔ مناجاتِ سحر اور آہِ نیم شبی قلب کی صفائی کا ذریعہ تو بن سکتی ہیں، لیکن کسی نظام کی تعمیر یا تخریب کا سبب نہیں بن سکتیں۔ مہاتما گاندھی کی مسلسل فاقہ کشی ہندوستان کی سرزمین سے انگریز کا جادو توڑنے میں ناکام رہی۔

کوہ طور پر چڑھ کر اللہ سے ہم کلام ہونے والا موسیٰؑ ایک بے بس انسان تھا جو فرعون کے خوف سے بھاگ کر مدین جا کر پناہ لینے پر مجبور ہوا، لیکن جب اسے ید بیضا اور عصا کی قوت میسّر آ گئی تو دہی پنا، لگیر موسیٰؑ فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے لگا اور بھرے دربار میں اس نے وقت کے جابر اور قاہر بادشاہ کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور پھر اسی عصا کی قوت سے وہ بحر احمر کا سینہ چاک کر کے ایک طرف بنی اسرائیل کو ساحلِ سلامتی پر لے گیا، تو دوسری طرف فرعون اور اس کی ذریت کا بیڑا غرق کر کے اسے آنے والی نسلوں کے لیے سامانِ عبرت بنا گیا۔[1]

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

---

[1] ۔ استفادہ از انداز بیان مرتبہ عبداللہ شاکر ص ۱۰۸

جس سے دِل دریا متلاطم نہیں ہوتا

اے قطرۂ نیساں، وہ صدف کیا وہ گہر کیا

فی الحقیقت دنیا طاقت کا لوہا مانتی ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی ہے بھینس اسی کی ہوا کرتی ہے۔ کتنا ہی پاکباز انسان ہو جب تک اس کے ہاتھ میں قوت نہ آئے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ؎

در کلیسا ابنِ مریمؑ را بدار آویختند

مصطفٰےؐ از کعبہ ہجرت کردہ بام الکتابؐ

انقلاب اے انقلاب

حضرت زکریا علیہ السلام کو آرے سے چیر دیا گیا۔ یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک رقاصہ کے اشارے پر قلم کر کے اسی آبرو باختہ رقاصہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ نبیؐ کے نواسے اور اس کے بہتّر ساتھیوں کو کربلا کے ریگزار میں پوری بے دردی اور سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ اور سیّد لولاکؐ مولائے کُل کو طائف کی وادی میں غنڈہ گردی کے ہاتھوں لہولہان ہونا پڑا اور مکّہ کے بازاروں میں بے بسی کے عالم میں بے کسی کی زندگی گزار کر آخر کار وطنِ مالوف سے ہجرت کرنا پڑی، لیکن جب طاقت میسّر آ گئی تو بدر کا میدان فتح کی خوشخبری لے کر حاضر ہوا، اُحد اور خندق کی گھاٹیوں سے گزر کر مسلسل کامیابی نے آپؐ کے قدم چومنے شروع کر دیئے۔ کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں یتیم مکّہ کے آگے جھک گئیں۔ فتح مکّہ کے بعد جاء الحق اور زھق الباطل کا نعرہ سات آسمانوں کا سینہ چیر کر عرشِ بریں جا ٹکرایا ؎

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو

آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

اے مردِ خدا تجھ کو جو قوت نہیں حاصل

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنا نظام برپا کرنا چاہتا ہے۔ سیاست ہو یا معیشت، تہذیب ہو یا تمدن، اخلاق ہو یا اعمال یہ ہر چیز کو اللہ کے رنگ میں رنگتا ہے، لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ یہ اس پاور ہاؤس پر مکمل قبضہ کرے جہاں سے طاقتیں تقسیم ہو کر ملک و قوم کی قسمتیں بنتی ہیں۔

اقتدار کے بغیر نہ کبھی اسلام قائم ہوا ہے اور نہ ہو گا، اسی لیے اسلام میں جہاد کو فرض قرار دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اسلام کے باغیوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنے کا قلع قمع ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

ایک طرف دینِ حق کے قیام اور آزادی کے حصول کے لیے قوّت درکار ہے اور دوسری طرف ان دونوں کی بقا اور استحکام کے لیے قوّتِ قاہرہ کی ضرورت ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہے نظر پیدا

ارشادِ خداوندی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید: ۲۵)

ترجمہ: ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔

یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی طاقت ہے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکتا ہے

(عبداللہ شاکر)

تصوّر اشتراکیّت

مغربی[1] تہذیب ہی کا مشہور فکری دجل اور منطقی مغالطہ اشتراکی تحریک ہے۔ اقبال کے عہد میں روس میں انقلاب آچکا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام کی قوت ٹوٹ رہی تھی۔ آپ نے اشتراکیت کے اس پہلو کو سراہا تھا کہ اس سے عوامی حقوق کے تحفظ کی کوئی صورت بنتی ہے لیکن یہ اثر محض وقتی تھا۔ جب آپ نے اشتراکیت کی علمی و فکری خامیوں کے ساتھ اس کے عملی مظالم کا تصور کیا تو اسے سخت ناپسند کیا اور فرمایا۔

ز آنکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مؤمن دماغش کافر است

دین آن پیغمبر حق ناشناس
ہر مساوات شکم دارد اساس

علامہ فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے دوسرے ازم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اپنے خطبات میں وہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ رقم طراز ہیں۔

"نہ قرون وسطیٰ کا تصوف، نہ قومیت اور نہ ملحدانہ سوشلزم ہی

---

[1] اقتباس از اقبال اور احیائے دین مولفہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۳۸

یاس زدہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر سکتے ہیں[2]۔"[3]

پھر فرماتے ہیں۔

"میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے[4]۔"

وہ اشتراکیت کے معاشی پہلو سے بھی مطمئن نہیں اور اسلامی نظام معیشت کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ قائداعظم کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"اس مسئلہ (یعنی معاشی مسئلہ) کا حل اسلامی آئین کی تنقید ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کما حقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا[5]۔"

آپ کا ایک بیان تو اشتراکیت کے بارے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

"بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔ میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے (اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے) کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن نے تجویز کیا ہے[6]۔"

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے نتیجے میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر وہ بصیرت افروز انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

---

[2] اقبال نامہ جلد ۲ ص ۱۸۹۔

[3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۹۔

[4] خطبات وارشادات اقبال صفحہ ۱۵۱۔

[5] خط بنام قائداعظم ۱۹۳۷ء۔

[6] روزنامہ زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء۔ اقتباس اور اقبال اور احیائے دین مولفہ ڈاکٹر خالد علوی ص ۳۸

"فی الحقیقت جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ آدمی کا عقیدہ، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات ہیں۔ میری نگاہ میں یہ چیزیں اس قابل ہیں کہ جن کی خاطر آدمی کا جینا اور مرنا ہو نہ کہ زمین کا ٹکڑا جس کے ساتھ عارضی طور پر روح انسانی کا رابطہ ہو گیا ہو۔[1]"

قائداعظم کو آزادی کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہو گیا ہے تو مسلمان اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔[2]"

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اشتراکیت سے بیزار تھے۔ اور اسلام ہی کو مکمل نظام مانتے تھے۔

وہ اپنے ایک پیغام میں مغربی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مختلف افکار و نظم پر ایسا تبصرہ کرتے ہیں جو حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں "ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے نیچے کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں روح آزادی اور شرف انسانیت کو اس طرح کچلا جا رہا ہے۔ کہ انسانی تاریخ کا کوئی تاریک ترین دور بھی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ وہ نام نہاد مدبرین جن کے ہاتھوں میں حکومت اور انسان کی زمام سونپی گئی تھی خونریزی اور جبر و استبداد کے شیطان ثابت ہوئے ہیں۔ وہ حکمران جن پر فرض تھا کہ وہ ان تصورات کی حفاظت اور ان کی آبیاری کرتے جن سے اعلیٰ انسانیت وجود میں

---

[1] خطبات و ارشادات (انگریزی) صفحہ ۵۶۔

[2] خط بنام قائداعظم ۱۹۳۷ء۔

آتی ہے، وہ انسان کو انسان کے تسلط سے بچاتے اور بنی نوع انسان کی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرتے انہوں نے اپنے غلبہ و تسلط کی بھوک میں مبتلا اور استعماری جبر میں اندھے ہو کر مخصوص گروہوں کی حرص و آز پورا کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا اور لاکھوں کو اپنے دام غلامی کا نخچیر بنایا۔ کمزور لوگوں کو غلام بنانے اور ان کی گردنوں پر اپنی حکومت کا جوا ڈالنے کے بعد انہوں نے ان کو ان کے املاک، مذہب، اخلاق تہذیبی و ثقافتی روایات اور لٹریچر سے محروم کر دیا۔ پھر انہوں نے ان کے اندر انتشار و تفرقہ کا بیج بو دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹیں اور جاگیرداری کے ڈنڈے تلے دب جائیں اور ملوکیت کی جونک کسی مداخلت کے بغیر پورے اطمینان کے ساتھ ان کا خون چوستی رہے۔[1]"

علامہ مرحوم کے نزدیک اشتراکیت بھی مغربی تہذیب ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور کیپٹلزم کی طرح یہ بھی بدنہادی اور لادینیت کا مرقع ہے۔ جاوید نامہ میں آپ نے اس نظام پر نہایت تیکھے انداز میں طنز کی ہے اور ابلہان قوم اسے تعریف سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

صاحب "سرمایہ" از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل

زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

غربیان گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

---

[1] خطبات و ارشادات اقبال، ص ۱۵۱۔

دین آن پیغمبر حق ناشناس
ہر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

علامہؒ مرحوم چونکہ سرمایہ داری کے بھی خلاف تھے اس لیے آپ نے اشتراکیت کے اس پہلو کا ذکر کیا جس سے سرمایہ دارانہ مظالم کا قلع قمع ہوتا ہے لینن خدا کے حضور میں آپ کے اسی جذبہ کی عکاسی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اس سے زیادہ وہ اشتراکیت کے حق میں کچھ نہیں کہتے۔ بحیثیت مجموعی آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اشتراکیت ایک لادینی منفی نظام ہے جو انسانیت کے لیے اسی طرح مہلک ہے جس طرح آمریت، قومیت اور مادیت وغیرہ

علامہ مرحوم اشتراکیت کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے بیان سے ہوتا ہے۔

"میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر نتائج سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ روسی بالشویزم یورپ کی عاقبت نااندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشویزم دونوں

افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے ..... اس (اسلامی) مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے معاشی نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر اکانومی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔"[1]

اس مفصل بیان کے بعد بھی اگر کوئی شخص اقبال کو اشتراکیت کا ہمنوا سمجھتا ہے تو ہم اس کے لیے دعائے خیر کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر خالد علوی)

---

[1] روزنامہ زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء۔

تصوّرِ غم

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے السر کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتّی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگین ہے وصل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز پہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ ربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کا کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے نا آشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا ہمنشیں ہے ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

استفادہ از بانگ درا ص ۵۵ تالیف علامہ اقبالؒ

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوششِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا لقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اسکے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجرِ ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ رواں زندگی
گر کے رفعت سی ہجوم نورِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

حضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(علامہ اقبال)

تصوّرِ وطنیّت

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(علامہ اقبالؒ)

۱؎ استفادہ از بانگ درا ص ۱۶۰ مصنفہ علامہ اقبالؒ

تصوّرِ آرزو

دنیا[1] کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو!
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

۱؎ استفادہ از بانگِ درا تالیف علامہ اقبالؒ ص ۴۶، ۴۷۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں ہو جائیں اتنے بلند نالے — تاراں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے — بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

(علامہ اقبالؒ)

تصوّرِ رہبانیّت

علامہ اقبال نے کے عقائد بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"دنیا مجموعۂ شر ہے اور یہی رہبانی زندگی کا اصل سبب ہے"

(فلسفہ عجم)

دوسری جگہ کہا ہے۔

"یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصوّر ہی تھا وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیّت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جمالی ہے"

(مضامینِ اقبال صفحہ ۱۱۴)

عالم کو شر سمجھنے اور اس سے قطع نظر کرنے میں عیسائی، ہندو اور بدھ مت ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ عموماً مابعد الطبیعاتی رکھنے والے فرقوں کا یہی خیال ہے جو عالم کو شر محض نہیں بھی سمجھتے ہیں وہ بھی چونکہ خدا کا تصور غیر مادی حیثیت سے کرتے ہیں اس لیے مادی عالم کا ترک اور مادی زندگی سے گریز ایک عام اصول بن گیا ہے اور اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مادّے کو شر محض اور روح سے غیر سمجھا گیا ہے۔

ہندی ایرانی اور عیسائی اربابِ فکر کے نزدیک روح مادے سے برتر اور ایک علیحدہ وجود ہے اور اس لیے روحانیت حاصل کرنے کے لیے

لہ استفادہ از نقد اقبال مولفہ میکش اکبر آبادی ص ۲۶۱

یقیناً مادّے اور مادّیات سے قطع نظر ضروری ہے۔ مادے سے قطع نظر کرنے والوں میں سے جو وحدت الوجود کے قائل تھے ان کے لیے یہ بات مشکل تھی کہ ہستی کی وحدت تو تسلیم کرلیں مگر روح و تند مادّے کی وحدت سے انکار کر دیں۔ اس لیے انہوں نے سرے سے مادّے کی ہستی ہی سے انکار کر دیا ان کے علاوہ دوسرے ارباب فکر جو روح کی کلیت اور حقیقت کے اطلاق کے قائل تھے مگر مادّی عالم کے وجود سے انکار نہ کر سکتے تھے، انہیں حقیقت کلی کو افراد سے مطابق کرنے کے لیے حلول کا نظریہ ایجاد کرنا پڑا۔ یعنی حقیقت کا تصور اگرچہ روح مطلق کی حیثیت سے مادے سے علیٰحدہ ہے لیکن روحِ مطلق کائنات کے ہر ذرے میں حلول کئے ہوئے ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مادے سے دکھائی دینے والا اور محسوس ہونے والا عالم مراد ہے۔

مسلمان صوفیوں اور خود علامہ اقبالؒ کے کلام میں بھی بظاہر اسی قسم کی تعلیم ملتی ہے مثلاً۔

مصطفٰےؐ اندر حرا خلوت گزید
مدّتے جز خویشتن کس را نہ دید
از کم آویزی تخیّل زندہ تر
زندہ تر جوئندہ پائندہ تر
(جاوید نامہ)

تو ہم بہ ذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند
خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی ہا
تو اے دردآشنا شو از آشنائی ہا
(زبور عجم)

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی
(ضرب کلیم)

"مادّیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے۔ مادہ کثرت ہے لیکن رُوح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے" (مضامین اقبال صفحہ ۱۴۴) اقبال فرماتے ہیں ؎

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا گفتن حرام است
بہ جاں پوشیدہ رمز کائنات است
بدن حالِ ز احوالِ حیات است
(گلشن زار جدید)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب روح اور مادہ ایک ہی ہیں تو صوفیوں اور خود علامہ اقبالؒ نے رہبانیت کے ماننے والوں کی طرح مادیت سے قطع نظر کرنے کی ترغیب کیوں دی ہے اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ اور صوفیا کا مقصد اور مسلک یقیناً زندگی سے گریز اور عالم کو شر سمجھ کر اس کا ترک کرنا نہیں ہے بلکہ خودی یا حقیقت کے انکشاف اور عالم کو صحیح طور سے دیکھنے کی نظر پیدا کرنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا مقصود ہے۔ خلوت ہمیشہ کے لیے اختیار نہیں کی جاتی ہے اور کم خوردن وغیرہ کا مقصد بھی ابتداء میں جمعیت خیال اور یکسوئی حاصل کرنا ہے۔ علامہ نے خود اس بات کو واضح کیا ہے ؎

گرچہ اندر خلوت خدا است — خلوت آغاز است و خلوت انتہا است

جب جلوت میں بھی خدا ہی کا ظہور ہے تو اس کے ترک کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ البتہ جلوت میں مشاہدہ کرنے والی نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ابتدا میں خلوت ضروری ہے۔

تصوّرِ عشق و فقر

اقبالؒ اپنے تصورِ عشق و فقر کے ذریعے انسان کو بے نیازی کی دولت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے اور یہ سرافرازی ایسی ہے کہ جس کے سامنے کج کلاہانِ وقت کی سروری، شان و شوکت جاہ و جلال اور مال و منال کچھ حقیقت نہیں رکھتے

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے

اس بناء پر فقر سرورِ کائنات کی مدح سرائی کچھ اس طرح کرتا ہے:

سماں الفقر فخری کارہا شانِ امارت ہیں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا،

اس کے ہاں عشقِ حقیقی یقینِ کامل کا دوسرا نام ہے اور جب اس کی بدولت انسان منصبِ فقر پر فائز ہو جاتا ہے تو مادیت اس کے سامنے خود بخود ہیچ ہو جاتی ہے۔

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند
ہمیں بس است کہ آئینِ جاکری داند
بچشمِ اہلِ نظر از اسکندر افزوں است
گدا گرے کہ مآلِ سکندری داند

پھر اسی نظم میں فقرِ حیدری کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا

استفادہ از "اقبال شناسی محور" مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص۔ ۱۷۱

گیا ہے۔

ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است ایں جا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند

علامہ حضرت علی مرتضیٰ کو فقر کی بہترین علامت سمجھتے ہوئے ایک اور جگہ یوں کہتے ہیں کہ۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اقبالؒ مادیت کے عفریت کو، جس کا ایک بڑا جزو سرمایہ داری ہے۔ "فقرِ غیور" کے ذریعے شکست فاش دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

"فقرِ غیور" کے اسی فیصلے کو ایک اور اسلوب میں بھی بیان کیا ہے جس سے زر پرستی اور مادیت کی اور اچھی طرح قلعی کھول دی ہے۔

من کی دنیا؛ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؛ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن۔

مختصر یہ کہ اقبال کا تصورِ فقر و عشق بھی سرمایہ دارانہ معاشرہ سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اس کی مکمل نفی ہے:

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری ✣ میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

(محمد معصوم عابدی)

تصوّرِ مغربی تہذیب

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو کرفاش اب اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

انسان[1] کی یہ کمزوری ہے کہ جس کی تلوار سے مار کھاتا ہے اس تہذیب سے بھی شکست کھا جاتا ہے۔ انگریز کی عیاری نے جب یہاں اپنی حکومت قائم کی تو اس نے اپنی تہذیب کے جال بھی پھیلانے شروع کر دیے اور اس جال میں نہ صرف فرزندانِ تاریکی ہی اسیر ہوئے بلکہ عالمانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین کی اولاد بھی اس کا ترنوالہ بن گئی۔ رزق کے دروازے بند کر کے انگریز نے چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں اور صلائے عام دے دی کہ جس کسی کو رزق درکار ہے۔ وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اپنا مقصود پائے۔

دل کے ہارے اور بھوک کے مارے انسان اوّل اوّل بے دلی سے اس کی طرف لپکے، لیکن بعد میں یہی تہذیب ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے گلے کا ہار بن گئی اور جس تہذیب کو ہم لعنت اور پھٹکار سمجھتے تھے۔ اسے محبوبِ دلربا سمجھ کر ایسا گلے سے لگایا کہ پھر اس کی جدائی ناقابلِ برداشت مرحلے میں داخل ہو گئی حالات حد درجہ خراب تھے، لیکن عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبالؒ

---

[1] استفادہ از انداز بیان مولفہ عبداللہ شاکر ص ۱۲۶

کو مہیا کیا۔

اس تہذیب کی مکروہ تصویریں قوم کے سامنے اس طرح بے نقاب کر کے رکھ دیں کہ اس چڑیل کے سارے خدوخال برہنہ ہو کر ہمارے سامنے آ گئے۔ فرنگی مدنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بے کاری، عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

مغربی تہذیب جس کا سفینہ طوفانِ زمانہ کے ہاتھوں غرق ہونے والا تھا اور جس کی بربادی کے جراثیم خود اس کے وجود میں پنہاں تھے، علامہؒ نے اپنے قلب کی آنکھوں سے بہت پہلے ہی ملاحظہ کر لیے اور اسی وقت فرما دیا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اور یہ آشیانہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی دو ہولناک عالمگیر جنگوں میں خاکستر ہو کر رہ گیا۔ اس تہذیب کا مدّعا ہمیں اپنے بلند مقصد سے ہٹا کر سفلی جذبات میں مبتلا کرتا ہے اور شاہین و عقاب کو کوؤں اور چیلوں کی فطرت میں ڈھالتا ہے ؎

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فساد
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

علامہ اقبالؒ مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے مسلمان سے فرماتے ہیں کہ یہ تہذیب سراسر دھوکا اور سراب ہے، تجھے اس دامِ ہمرنگِ زمیں میں نہیں پھنسنا چاہیے ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

نہ ڈھونڈھ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اور پھر اسے اپنی بلند منزل کی طرف پرواز کرنے کے لیے کہتے ہیں ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

مغربی تہذیب اب موت کی وادی میں پہنچ چکی ہے، اسے کوئی مسیحا زندگی سے ہمکنار نہیں کر سکتا ؎

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دلِ سینہ بے نور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں گلیسا کے یہودی متولّی

مسلمان جو آج کل سینما کی اداؤں کا شکار ہے جو ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے عشوؤں کا دلدادہ ہو رہا ہے، اسے سینما کی حقیقت بتاتے ہوئے آگاہ کرتے ہیں ؎

وہی بت فروشی، وہی بُت گری ہے
سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ ہمسد کہن کا
یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹّی، یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی، یہ خاکستری ہے

مسلمان کی تہذیب، اس کا تمدّن مغربی تہذیب سے بالکل الگ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب ہی امنِ عالم کی ضامن ہو سکتی ہے اور مسلمان کو اقوامِ عالم کا امام بنا سکتی ہے اور یہ دنیا جو جہنّم کے کنارے پہنچ چکی ہے اسے پھر راحت کی زندگی سے ہمکنار کر سکتی ہے ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے
سرورِ حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو ضرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے
مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روِش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

(عبداللہ شاکر)

تصورِ نشاۃِ ثانیہ

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

غلامی اس عالمِ رنگ و بو کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ جسے توحید کا علمبردار کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

علامہ اقبالؒ جن کی نگاہِ پردہ کشا پردوں کے پیچھے آنے والے انقلاب کو بے پردہ دیکھ رہی تھی اس خطرے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ آپ کی چشمِ جہاں بین نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے صدارتی خطبے میں انگریز کو صاف صاف بتا دیا کہ برصغیر کا مسلمان انگریزی استعمار کے بعد ہندو استحصال کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا، لہٰذا اسے آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ان علاقوں میں خود مختاری سے بہرہ ور کیا جائے جہاں ان کی اکثریت زندگی کے برے بھلے دن گزار رہی ہے۔ یہ مطالبہ گویا مسلمانانِ ہند کے اس تقاضے کی تمہید تھا جسے نشاۃِ ثانیہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ مرحوم کی نظر میں نشاۃِ ثانیہ صرف ایک علیحدہ خطے کے حصول کا نام نہیں

لہ استفادہ از انداز بیان مولفہ عبداللہ شاکر ص ۱۵۷

تھا، بلکہ اسلام کے عالمگیر نظامِ حیات کو بالفعل برپا کرنے کا فریضہ ملی تھا، جس کے لیے امتِ مسلمہ کو کارگاہِ حیات میں بھیجا گیا تھا۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ صدیوں کی غلامی کے بوجھ تلے پسی ہوئی قوم کو ان اوصافِ حمیدہ سے آراستہ کیا جائے جو اس زرنگار ایوان کی تعمیر کے اوّلین معمار ہیں سرفہرست اتفاق و اتحاد کا بنیادی پتھر ہے جس کے بغیر کوئی قوم جولانگہِ حیات میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ آپ کا ارشاد ہے ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس اتحاد کی تلقین کا نغمۂ اوّلین ہے ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انسان کو
اُخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسبت ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

دوسری چیز مقصد کا والہانہ عشق اور بلند نصب العین کی دھن ہے جو جوشِ کردار سے پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے کیونکہ جوشِ کردار سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور جوشِ کردار سیل ہمہ گیر بن کر بلند و پست پر چھا جاتا ہے صفِ جنگاہ میں مردانِ حق کی تکبیریں جوشِ کردار سے خدا کی آواز بن جاتی ہیں جو انفس و آفاق میں اسلامی نظامِ حیات کا صور پھونک کر مسافرانِ راہِ حق کو سرگرم ستیز کر دیتی ہیں۔ علامہ اقبال یہی نفیر پھونکتے ہیں جو انفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا - کی عملی تعبیر بن کر مسلمان کو سرگرمِ عمل کر دیتا ہے لہ

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

تیسری اور سب سے کارگر چیز جو مومن کے دل میں آباد ہے وہ عشقِ رسولؐ ہے کہ یہ وہ بم ہے جس سے ایک طرف کفر و الحاد کی دنیا نیست و نابود کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف امنِ عالم خوشگوار ہوائیں چلا کر باغِ ہستی کو حدیقۂ ارم بنایا جا سکتا ہے جس کے چپے چپے پر خدا کی رحمتیں آدم خاکی کا استقبال کرتی ہیں، عشقِ رسولؐ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نیشہ اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگوست
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہ و مسدرا

اس نصب العین کی حامل قوم کو مسلسل جدوجہد کا پیغام سناتے ہیں ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ یورپ یہ پچھم چکوروں کی دنیا — ترا نیلگوں آسماں بے کرانہ

مردِ مومن وہ شہبازِ طریقت اور ہمائے غیور ہے جس کے سامنے دنیا پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کے لیے سب سے پہلے حکیم الامت نے مردِ مومن کو مغربی تہذیب کے مفاسد سے مجتنب رہنے کی تلقین کی، کیونکہ اس کے بغیر نشاۃ ثانیہ کی منزل پر پہنچنا ناممکنات میں ہے ہے ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

(عبداللہ شاکر)

تصورِ خودی

اقبالؒ[1] کا نظریۂ خودی درحقیقت عظمتِ آدم کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔ یہ قرآن حکیم کی اس تعلیم پر مبنی ہے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات ہے، اور یہ کائنات اس کے لیے تخلیق کی گئی ہے یوں تو بیشتر عناصرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کو روزِ اوّل سے ہی انسان کے تابع کر دیا گیا تھا، حتیٰ کہ روزِ تخلیق، ملائک کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن جن قوتوں نے اس کی برتری تسلیم نہ کی، انہیں نافرمانی کا مظہر قرار دے کر ان سے جنگ کو اس کی زندگی کا مقصد قرار دیا گیا۔ یہیں اس شعور کی نمود ہوتی ہے، جسے اقبالؒ نے خودی کا نام دیا ہے۔ یہی خودی اقبالؒ کے کلام کا ایک بنیادی موضوع ہے، جس کے متعلق ان کے کافی بسیط ارشادات موجود ہیں۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

---

[1] استفادہ از "اقبال شناسی اور محور" مؤلفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۱۹۲ مقالہ شاہدہ ارشد

اقبالؒ کے نزدیک حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے، اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت یا عرفانِ نفس ہے۔ فرماتے ہیں:۔

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

اور یہ سلسلہ اتنا بڑھنا چاہیے کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؒ نے مسلمانوں کو خودی کا وہی تصور دیا ہے، جو قرآن نے مسلمانوں کے لیے متعین کیا ہے۔ کچھ لوگوں کے ذہن میں اس قسم کے اشعار سے غلط فہمی پیدا ہو گئی، جن کی ایک مثال خواجہ حسن نظامی کی طرف سے ان کی "مثنوی اسرارِ خودی" پر اعتراضات ہیں، جن کے سلسلے میں اقبالؒ نے لکھا۔

"مجھے خواجہ صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ قرآن شریف میں کہیں زیادہ خودی کی تعلیم ہے اور اگر یہ تعلیم انوکھی اور نرالی ہوتی تو میں ہرگز اسے مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا یاد رہے کہ یہ مثنوی زمانۂ حال کے کسی منصور کی لکھی ہوئی نہیں، جو اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ میں قرآن جیسی عبارت لکھ سکتا ہوں، بلکہ ایک مسلمان کی لکھی ہوئی ہے، جس نے قرآن سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کی تعلیم کو بنی نوع انسان کی نجات کا باعث تصور کرتا ہے۔"

اقبالؒ جب خودی کو بلند کرنے کی بات کرتے ہیں، تو بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سے مراد خود سری یا خود پرستی کی انتہا ہے، لیکن علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں خودی کو بلند کرنے کا ذکر کرتے ہوئے دراصل خود شناسی

کی دعوت فکر دی گئی ہے، جس کی تائید اقبال کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے
تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اس سلسلے میں دوسرا شعر خصوصاً توجہ طلب ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دعا خود مانگنے والے پر اثر کرتی ہے اور اس طرح دعا کرنے والے کے اندر تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہ بالکل واضح ہے اس طرح جب دعا مانگی جاتی ہے تو اس سے خود اپنے آپ کو یاد دلایا جاتا ہے کہ فلاں مقصد حاصل کرنا ہے یہ دعا کے ذریعے بار بار کی یاد دہانی دراصل عزم میں استقامت پیدا کرتی ہے، اور پھر عزم کی استقامت کا درجہ جوں جوں بلند ہوتا ہے، دعا مانگنے والے کی اہلیت اور معیار بھی بدل جاتا ہے اس میں اہلیت کی مقدار عزم کے معیار کے مطابق بڑھتی ہے۔

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہ رسا دیکھ

اقبالؒ کے نزدیک خودی کے تین مرحلے ہیں: پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے، جس کے مطابق مسرت و شادمانی آزادہ روی سے نہیں، بلکہ ایک خاص ضابطۂ حیات کی پابندی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

دوسرا درجہ ضبطِ نفس کا ہے اس کے مطابق انسان کو اپنی خواہشات پر قابو پانا چاہیے۔

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

تیسرا درجہ نیابت الٰہی کا ہے اور اسے حاصل کرنا خودی کا بلند ترین نصب العین ہے اقبالؒ کے مردِ مومن میں اسے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے یہ زمانے کے دھارے میں بہتی اور اس کی موجوں کے ستم سہتی ہوئی آدم خاکی کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جب انسان یا کوئی قوم اس کو پالیتی ہے تو تسخیر کائنات کا عمل اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور انسان کی روح مادے پر فتح حاصل کر لیتی ہے۔ اس لیے اقبالؒ بار بار اس کی تعمیر کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

خودی کی تعمیر کے لیے عشق یعنی اپنے مقصد سے سچی لگن کی انتہائی ضرورت ہے۔ اس لیے اقبالؒ کے ہاں عقل اور عشق کی کشمکش جاری رہتی ہے ان کے نزدیک عشق ہی وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان میں فکر و عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اقبالؒ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اور عقل کو اس کے تابع کرتے ہیں۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

عقل اسباب و علل کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے دور ہو جاتی ہے مگر عشق منزل کو پالیتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبالؒ کے نزدیک انسانِ کامل کا معیار حضورؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔

انہی کی پیروی سے انسان کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے، جسے اقبالؒ نے یوں پیش کیا ہے۔

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افشردہ و خوار
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اقبالؒ کا مردِ مومن جب اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا اہل ثابت کر لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اقبالؒ کے مردِ مومن کو نیٹشے کے "فوق البشر" کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کیونکہ مردِ مومن تو اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ اور پوری زندگی میں خدا تعالیٰ کا مطیع ہوتا ہے۔ جب کہ "فوق البشر" کسی اخلاقی پابندی کو قبول رکھنے کے باوجود شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جاتا ہے۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اقبالؒ کے کلام میں جگہ جگہ سخت کوشی کے متعلق اشعار ملتے اور حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ نے جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کی ہے، وہ سخت کوشی ہی کی ایک ارفع صورت کا نام ہے۔ جب تک کوئی شخص سخت کوشی نہ ہو، وہ اپنی خودی کی حفاظت بھی نہ کر سکے گا اور اگر انفرادی خودی کی حفاظت نہ ہو سکے تو اجتماعی یا قومی خودی کی حفاظت بھی ناممکن ہے۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

اور

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی

قوم کا انداز نظر بدلنا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، جو صرف خاص بلکہ برگزیدہ اشخاص کے حصے میں آتا ہے اور اگر اندازِ نظر صحیح ہو تو اس سے حیات تازہ پیدا ہوتی ہے۔ اقبالؒ قوم کو بلند پروازی کی طرف مائل کرتے ہیں وہ اس کے لیے ایک اصول متعین کرتے ہیں اور وہ ہے خودی کی تربیت:۔

خودی کی پرورش و تربیت یہ ہے موقوں
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شبیبؓ و شبانیِ شب و روز

اقبالؒ کے نزدیک قصرِ ارتقاء کی بنیاد صرف شعورِ خودی کو چھو لینے سے نہیں رکھی جاتی، اور علم و حکمت کے گراں بہا موتی بکھیر دینے سے ہی غایت تخلیق کی منزل تک رسائی نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ منزل کو حاصل کیے بغیر کامیابی و کامرانی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

اقبالؒ نے علم و حکمت کا جو کامل نسخہ آزادی و بادشاہی کے استقبال کے لیے تیار کیا تھا اسے اپنی قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اپنے آپ کو پستی و ذلت اور کمزوری و بے ہمتی کی ہر کیفیت سے بالاتر سمجھیں اور اپنے آپ کو اخلاقی و روحانی عظمت کے احساس سے مالا مال کریں۔ اقبالؒ جب اپنے دور کے حالات سے مایوس ہوتے ہیں تو اس طرح شکوہ سنج ہوتے ہیں۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

اقبالؒ کو کامل یقین تھا کہ اگر نوجوان ان صفاتِ عالیہ سے متصف ہو کر عرصۂ عالم میں اتریں تو وہ تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتے ہیں وہ انہیں امید کی کرن دکھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

خودی کا تصور، ایک مرکب تصور ہے جو تین واضح احساسات کو منظم صورت میں سامنے لاتا ہے۔ پہلا احساس اپنی رفعت و عظمت کا ہے، جو اس دنیا میں خدا کا نائب اور اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنہ کا وارث ہونے کے اعتبار سے انسان کامل کی صورت میں جاگزیں ہونا چاہیے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

دوسرا احساس ان ممکنات کا احساس ہے جو اشرف المخلوقات ہونے کے لحاظ سے اس کی حدود میں محصور ہیں۔

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

تیسرا احساس اس یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے جو مومن تخلیق کے مقاصد کی اساس پر استوار ہوتا ہے۔ یہ تینوں احساس مجتمع ہو جاتے ہیں تو اسے ہم خودی کی کیفیتِ بیداری کا نام دیتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ تہذیب افرنگ سے متاثر ہونے والوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

اقبالؒ نے تو منبر و محراب کے حاملوں اور ذکر و فکر کے متوالوں کو بھی صاف کہہ دیا ہے۔

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور:

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلہ تم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

اقبالؒ کے ہاں خودی کا تصور ہمہ گیر وسعتوں پر محیط ہے۔ وہ گرد و پیش اور ماضی و حال کے تمام مسائل اس کی روشنی میں حل کرنے کے آرزومند ہیں۔ انہوں نے اس سرِ مخفی کے متلاشیوں کو بھی متنبہ کر دیا ہے۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر، تو چارہ نہیں
خودی کی خلوتوں میں کم رہا ہیں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں

اقبالؒ کے دل میں جب ملت اسلامیہ کی وحدت کا تصور شدت سے ابھرا تو ان کو کامل یقین ہو گیا کہ ہندی مسلمانوں بلکہ مسلمانانِ عالم کی نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ اپنی خودی بیدار کریں اور اسلامی اقدار کو زندہ کریں اور ایسے اصول وضع کریں جن کی صداقت پر گردشِ زمانہ نے بیسیوں بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا

چنانچہ وہ دعوتِ عمل دینے کے انداز میں کہتے ہیں۔

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
بزنگ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

اور

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

اقبالؒ یہ محسوس کرتے ہیں کہ فرد اس لیے سرنگوں ہے کہ وہ افق کی طرف نگاہ بلند کرنے کی بجائے مٹی میں رنگین ٹھیکریاں چننے لگ گیا ہے اور قوم اس لیے بدحال اور پریشان ہے کہ وہ اپنی عظمت کے احساس سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ وہ فرد اس کو غلط روی سے آگاہ کرتے ہیں اور قوم کو اس کے اصل مقام سے بار بار آشنا کرتے ہیں۔

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی
یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا، ہے مقام بادشاہی
خودی ہو علم سے محکم، تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم، تو صورِ اسرافیل

اسلام ایک مخصوص جامع نظریۂ حیات ہے، اور اسی کے مطابق مومن کی خودی اور خودداری پرورش پا سکتی ہے۔ اقبالؒ خودی کے استحکام کے لیے توحید کا درس

دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

خودی کا سرنہاں لاالہ الااللہ
خودی ہے تیغ، فساں لاالہ الااللہ

اقبالؒ خودی کا فقید المثال درس دے کر ہمارے سامنے ایک ایسا مثالی انسان پیش کرتے ہیں، جو خود اپنا راہنما ہوتا ہے اور جب اس کے جذبات میں خودی کی گرمی اور آنچ آتی ہے تو اس کا کردار ایک نئے سانچے میں ڈھلتا ہے اور اس کی نفسیات ایک خاص وضع اختیار کرتی ہے، اور اس میں مومن کی صفات ابھرتی ہیں۔ کوئی بھی ملت محض نقلی کی بدولت عظمت و رفعت حاصل نہیں کرتی۔ ملت اسلامیہ کا احیاء اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی خودی میں غوطہ زن ہو اور اپنی زندگی دوسروں کی نگاہ سے نہ پرکھے۔

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

(از شاہدہ ارشد صاحبہ)

تصورِ معیشت

مختلف معاشروں میں انسانوں کے درمیان تقسیم دولت کے مختلف طریقے نافذ ہیں، یہی طریقے نظام ہائے معیشت کہلاتے ہیں، سرمایہ داری اور اشتراکیت اس سلسلے کے دو مشہور نظام ہیں۔ اس وقت ہماری بحث کا دائرہ سرمایہ داری تک محدود ہے۔ "سرمایہ داری"! جسے ہم خالص انفرادی نظام معیشت بھی کہہ سکتے ہیں، معاشرے میں دولت کی تقسیم کا ایسا طریقہ ہے جس میں آجر و ماجور کی طبقاتی تقسیم ظلم اور ناانصافی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اس نظام میں ایک انسانی طبقہ خام مال اور وسائلِ قدرت پر ناجائز تصرف کی بدولت اپنے ہی جیسے کچھ انسانوں کو طبقاتی طور پر اپنا غلام بنا کر ان کی محنت کو انتہائی سستے داموں خریدتا ہے اور اس طرح معاشی طور پر ان کا استحصال کرتا ہے۔ مزدور کی کائنات صرف وہ اُجرت ہوتی ہے، جو اسے اس کی قوتِ محنت کے معاوضہ میں ملتی ہے اسی اُجرت پر مزدور اور اس کا خاندان زندہ رہتے ہیں۔ مزدور کارخانے کی پیداوار کی قیمت بڑھاتا ہے۔ مزدور کی محنت سے سرمایہ دار کو اس قدر زائد منافع ملتا ہے کہ وہ اپنی خام اشیاء کی قیمت کئی گنا زیادہ وصول کرتا ہے لیکن بیچارے مزدور کو نانِ سبینہ بھی یہ مشکل نصیب ہوتی ہے، اس اُجرت میں سے مزدور اس لیے اپنا پیٹ بھرتا ہے تاکہ تھوڑی سی توانائی حاصل کرے اور دوسرے دن پھر کام پر جا سکے۔ مزدور کی زندگی ایک مشین کی طرح حرکت

لہ استفادہ از اقبال شناسی اور محمود، مولفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۶۳ تالیف محمد معصوم عابدی

کرتی رہتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ دار کا محتاج بن کر اپنی زندگی کا جوہر اس کے سپرد کرتا رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ سرمایہ داری دولت کی ناہموار اور غیر منصفانہ تقسیم پر اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی ظلم و تعدی کی طرف اس طرح اشارہ بھی کیا ہے۔

خواجہ نانِ بندہ مزدور خورد
آبروئے دخترِ مزدور برد

اس نظامِ معیشت کے بالکل برعکس اقبالؒ ایسے اسلامی نقطۂ نظر کا حامل ہے جس میں دولت کی تقسیم غیر عادلانہ نہیں ہوتی لہٰذا اس بنیاد پر طبقات بھی تشکیل نہیں پاتے۔ ملکیت زمین و جائداد کے خدائی تصور "الارض للہ" کی تشریح بڑے انوکھے انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لاتا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اقبالؒ ارتکازِ زر کی سخت مخالف ہے اور تحریک ابوذرؓ کا شدید حامی! اسی لیے کبھی وہ قیصر و کسریٰ کی تباہی کو فقر ابوذر کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

اور کبھی اسے اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے:۔

نعرۂ حیدر نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلقِ بلالیؓ و قنبرؓ است

اس کی نظر میں تمام انعاماتِ الٰہیہ کے فیوض و برکات میں تمام بنی نوع انسان کے حقوق مساوی اور یکساں ہیں۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

چونکہ اقبالؒ عدل و مساوات پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہے اس لیے سرمایہ داری کے پسِ پردہ ظلم بھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا، وہ سرمایہ داری نظام میں مزدور کی حالتِ زار دیکھتے ہوئے خالقِ کائنات سے لینن کی زبان میں شکوہ کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اور پھر چونکہ وہ سرمایہ داری کے جلد خاتمے کا متمنی ہے۔ لہٰذا یہ استفسار بھی کرتا ہے:۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اقبالؒ جس صدی میں پروان چڑھا، اسی صدی میں بلادِ مغرب کی سرمایہ داری انتہائے عروج پر پہنچ کر مائل بہ زوال تھی، اس لیے اقبالؒ کی چشمِ حق نگر نے سفرِ مغرب کے دوران اگر تلخیٔ مزدور کو ملاحظہ کیا تو ساتھ ہی ساتھ چین کے

محنت کشوں کی جدوجہد نے اس کی زبان سے یہ مژدۂ جانفزا بھی سنوایا

زمانے کے اندر بدلے گئے
نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

اسی طرح "بانگ درا" کی ایک نظم میں علامہؒ نے حضرت خضرؑ سے یہ سوال کیا ہے:-

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور حضرت خضرؑ سے جو جواب دلوایا ہے، وہ بڑا انقلاب انگیز ہے۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا؟ ہے یہ پیامِ کائنات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

ایک اور نظم میں وہ خالقِ ارض و سماء کی زبان سے فرشتوں کو یہ حکم بھی دلواتا ہے:-

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اوپر کے اشعار پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے۔ اقبالؒ مظلوم طبقات کو بالواسطہ طور پر سرمایہ داری کے خلاف مسلح جدوجہد کی تلقین کر رہا ہے اور اسی کو راہِ نجات سمجھتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف بہت مؤثر انداز میں صدائے احتجاج بلند کی اور مزدوروں کو ان کی راہِ عمل کی واضح نشاندہی کی۔ بیسویں صدی کا آغاز مارکس ہی کے انقلابی فلسفے پر عمل کرنے والے لینن کی قیادت میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا۔

اقبالؒ نے مارکس اور لینن کے فلسفوں کی بھرپور تائید و حمایت کی مگر یاد رہے کہ یہ تائید و حمایت صرف سرمایہ داریت کے خلاف تھی کیونکہ روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ذہین اقبالؒ سراسر مادیت پرستی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اسی لیے مارکس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی کتاب "سرمایہ" کے حوالے سے لکھتا ہے :۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر است
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

مارکسی اشتراکیت وجودِ باری تعالیٰ کی نفی کرتی ہے اور مساواتِ معیشت کو سب کچھ سمجھ کر اس میں انقلاب چاہتی ہے جب کہ اقبالؒ پہلے ذہن و نظر کا خواہاں ہے۔

تبھی تو کہتا ہے کہ۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے اگر اشتراکیت کو سرمایہ داری کے خلاف مکمل اور جامع جواب قرار دیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ اس میں خدا اور اخلاقیات مذہب کی چاشنی بھی موجود ہو تاکہ دنیا و عاقبت دونوں سنور جائیں۔ اسی بناء پر اقبالؒ نے اپنی تحریروں میں کہیں کہیں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ مثلاً

غلام السیدین کے نام ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں۔

"سوشلزم کے مترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظِ افیون سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور

انشاء اللہ مسلمان مروں گا میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔۔۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا۔۔۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے۔ یعنی جو افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم تو اسلام بھی خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمانی سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا۔"

۱۹۳۱ء میں سر فرانسس بریمنڈ کے نام خط میں یہاں تک لکھ دیتے ہیں۔

"سوشلزم کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک چیز ہیں۔"

ان تمام تحریروں سے ظاہر ہے کہ اقبالؒ کا ذہن سرمایہ داری کو ترامیم کے ساتھ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں، بلکہ جہاں تک اس نے اشتراکیت کی ہمنوائی کی ہے، اس کا راز بھی شکست سرمایہ داری میں مضمر ہے۔

علامہ مرحوم نے "پیام مشرق" میں صحبتِ رفتگاں کا کیا خوب اہتمام کیا ہے، جس میں سب سے پہلے "ٹالسٹائی" کہتا ہے :۔

دارو ئے بے ہوشی است تاج، کلیسا، وطن
جانِ خدا داد خواجہ بجامے خرید

اور پھر علامہ کے ذریعے کارل مارکس کی یہ صدا ہم تک پہنچتی ہے جس سے سرمایہ داری کا پردہ چاک ہوتا ہے :

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہؒ بھی سرمایہ داری کا توڑ مزدوروں کی جدوجہد کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا "پیام مشرق" کی ایک اور نظم۔ "نوائے مزدور" میں اپنے جذبات قلب کچھ اس طرح رقم کرتے ہیں۔

مغان و دیر مغان را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

علامہؒ نے ایک اور نظم میں سرمایہ داری کے خلاف اظہارِ خیالات کے لیے لینن کی زبان استعمال کرتے ہوئے خالقِ کائنات سے برملا یہ سوال کر دیا ہے:۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود ؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات

خداوندِ عالم سے اس انداز میں گفتگو کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا، لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

(محمد معصوم عابدی)

تصوّرِ فاشزم

ہمارے[1] یہاں بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ایک تحریک کا آغاز ہوا جو نیم ادبی اور نیم سیاسی تحریک تھی۔ اس تحریک کے پیروکار ترقی پسند کہلواتے تھے اور تحریک کے دائرے سے باہر رہنے والوں کو رجعت پسند قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں نے ہمارے قدیم ادبی سرمائے کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی اور ان تمام نظریات کی مخالفت کی جو اشتراکیت سے کسی نہ کسی طرح متصادم ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں ابتدائے تہذیب سے لے کر آج تک جتنے نظریات، فلسفے اور مذاہب دنیا میں رائج ہوئے، سب کے سب غیر حقیقی، خیالی اور متضاد تھے، البتہ کارل مارکس کے نظریات حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے معاصرین میں خصوصاً ان لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا جو کسی دوسرے فلسفۂ زندگی کو صحیح سمجھتے تھے۔ چونکہ اقبالؒ اس زمانے میں بڑے مقبول تھے اور ان کا نظریۂ حیات اسلامی تھا، اس لیے ترقی پسند نقادوں نے ان کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی منجملہ دیگر الزامات لگانے ان پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ وہ فاشزم کے علمبردار ہیں۔ چونکہ انگریزوں کے پروپیگنڈے نے فاشزم کو ایک گالی کے مترادف بنا دیا تھا، اس لیے ترقی پسندوں کو توقع تھی کہ اس سے اقبالؒ کو بدنام کرنے میں خاصی مدد ملے گی۔ اقبالؒ کو فاشی قرار دینے کی ابتداء اختر حسین رائے پوری

---

[1] استفادہ از اقبال شناسی اور محولۂ مولانا ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۷۷ — از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سے ہوئی۔ بعد میں کچھ اور ترقی پسندوں نے بھی اس رائے کو اپنے لفظوں میں دہرایا۔ بعض لوگوں نے اس کی تردید کی جن میں عزیز احمد اور آل احمد سرور پیش پیش تھے، مگر اختر حسین رائے پوری نے رائے کو بار بار دہرایا اور اس پر اڑے رہے۔ اس رائے کا تجزیہ کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختر رائے پوری کے وہ اقتباسات پیش کیے جائیں۔ چونکہ دوسرے ترقی پسند نقادوں نے اختر رائے پوری کے دلائل ہی کی تکرار کی ہے اس لیے اس تجزیے میں سب ترقی پسندوں کی تنقید کا جواب خود بخود مل جائے گا لکھتے ہیں۔

"اقبالؒ فاشیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری کے سوا کچھ نہیں۔"

دوسری جگہ ذرا وضاحت کی ہے۔

"اقبالؒ کا فلسفۂ زندگی کہتا ہے کہ دنیا کو سائنس اور مشینی صنعت سے منہ موڑ کر قدیم مذہبی نظام کی طرف آنا چاہیے جس کی تدوین مومنوں کے ہاتھ سے ہوگی۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے شاہین کی مثالی پر عمل کرنا ہوگا، یعنی بوقت ضرورت جبر سے کام لینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ مغربی سائنس اور صنعت کی مخالفت اور ایک بہتر اخلاقی نظام کے نام پر ایک اقلیت کی ڈکٹیٹری فاشزم کے بنیادی عناصر ہیں۔ قالب میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن روح وہی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ نے اپنے بہت سے اشعار میں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے زمانے پر محیط ہیں، اٹلی اور اس کی انقلابی تحریکوں سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ "بانگِ درا" کے دوسرے حصے کی غزلیات یہ شعر ملتا ہے۔

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو!
جہاز پر ہے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

اس میں مازنی کی حب الوطنی کی تحریک کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس زمانے کا شعر ہے، جب اقبالؒ کے لیے وطنیت کا جغرافیائی تصور باعث کشش تھا اس کے بہت بعد "بالِ جبریل"، "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"، "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" میں کہیں کہیں اٹلی کے اس انقلاب کا ذکر آگیا ہے، جسے فاشی انقلاب کہا جاتا ہے اور جس کا برپا کرنے والا مسولینی تھا یہ انقلاب ۱۹۲۲ء میں آیا اور مسولینی اقبالؒ کی وفات کے سات سال بعد تک بلا شرکت غیرے اٹلی کا حکمران رہا اور بالآخر پھانسی پائی۔ مسولینی نے اٹلی کے لوگوں کو جو نیا سیاسی نظریہ دیا، اس کو فاشزم کہا جاتا ہے۔ یہ یورپ اور ایشیا میں آمریت کے عروج کا زمانہ تھا، جس کے دو اہم اسباب کمزور جمہوری حکومتوں اور پہلی جنگ عظیم کے بعد کا عظیم اقتصادی دباؤ تھے۔ اٹلی کی مثال سے فائدہ اٹھا کر جرمنی، ارجنٹائن اور جاپان وغیرہ میں بھی آمر برسر اقتدار آگئے۔ چونکہ بنیادی طور پر اطالوی فاشزم اور ان ممالک کی نظریاتی بنیادی ایک جیسی تھیں اس لیے انہیں بھی فاشزم کے ماتحت شمار کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ اقبالؒ نے صرف اٹلی کا ذکر کیا ہے، اس لیے ہمارا مطالعہ اٹلی کی فاشزم اور اقبال کے نظریات کے تقابل تک محدود رہے گا۔

تاریخ دان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شروع شروع میں مسولینی کی فاشزم دنیا کے لیے خطرہ معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن بعد میں اس میں توسیع پسندی اور نسلی منافرت کے خطرناک رجحانات پیدا ہونے شروع ہوئے اور آخر اس نے دنیا کو دوسری جنگ عظیم میں ڈھکیل دیا جو دنیا کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد ہی ختم ہوئی۔ اقبالؒ فاشزم کا انجام نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ البتہ اس کے پہلے دو ادوار انہوں نے ضرور دیکھے، یعنی پہلے پہل جب یہ تحریک اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کی ضامن بن رہی تھی اور اسے شہنشاہی اور قدامت پسندی سے نجات دلاتی نظر آتی تھی۔ اس وقت

اقبالؒ نے اس کی تعریف و توصیف کی۔ بعد میں جب مسولینی نے ہر پرزے نکالنے شروع کیے اور افریقہ اور یورپ کے ممالک پر بھی للچائی ہوئی نظریں ڈالیں، تو اقبال نے اس کی مخالفت کی۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں اس لیے کہ دونوں نظریات فاشزم کے عروج کے دو مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے۔

ملتِ رومی نژاد، کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوتی پھر جواں
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب!
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
رومۃ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب

لیکن جب مسولینی نے ابی سینا پر چڑھائی کر دی، تو اقبالؒ کا لہجہ نمایاں طور پر بدل گیا۔

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئنہ
رومانے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسیا! یہ حقیقت ہے دلخراش

اقبالؒ نے جب مسولینی اور اس کی حکومت کی توصیف کی تو اس کے کئی نفسیاتی محرکات تھے۔ انہیں قوموں کے انقلابوں سے دلچسپی تھی وہ بھی اس بناء پر کہ شاید کوئی انقلاب بنی نوع انسان کے لیے بہتری کا پیغام لائے۔ ذہناً اقبالؒ ہمیشہ سے اس فلسفے کے قائل رہے تھے کہ قوموں کو زوال سے عروج تک لے جانے میں بالعموم کسی صاحبِ صفات مردِ واحد کا ہاتھ ہوتا ہے

۱۹۲۳ء میں جب مسولینی نے انہیں ملاقات کے لیے بلایا تو اقبالؒ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور انہیں خیال ہوا کہ شاید وہ انہی صاحبِ صفات مردوں میں ہے غرض یہ سب نفسیاتی محرکات مل کر اقبالؒ سے مسولینی کی توصیف کرا لینے کے ذمہ دار ہوئے لیکن ان تمام تعریفی اشعار کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعریف صرف مسولینی اور اس کی تحریک کے جذبے اور سعی مسلسل ہی کی ہوئی ہے نہ کہ فاشزم کے نظریات کی

اختر حسین رائے پوری نے ان ساری وجوہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور محض آنکھیں بند کر کے یک طرفہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اقبال کو مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر فاشی قرار دیا ہے۔

۱۔ جدید سائنس اور مشینی ترقیوں کو برباد کر کے ماضی کی طرف واپسی۔
۲۔ بوقت ضرورت طاقت سے کام لینا اور طاقت کی علامت اقبالؒ کے کلام میں شاہین ہے۔
۳۔ بہتر نظام کے نام پر اقلیت کی ڈکٹیٹری۔

ان تین وجوہ کی بناء پر وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اقبالؒ کے نظامِ فکر اور فاشزم میں قالب کا فرق ہے مگر دونوں کی روح ایک ہی ہے۔

یہ تینوں دلائل بوجوہ ناقص ہیں۔ ان میں کئی دانستہ غلط بیانیاں اور کئی نادانستہ کوتاہیاں موجود ہیں۔ معلوم نہیں اختر رائے پوری نے یہ کس "FASCIST MANIFESTO" میں پڑھا ہے کہ جدید سائنس کی ترقیوں کو برباد کر دیا ہے۔

فاشزم کے دستور العمل کے متعلق سب سے مستند تحریریں خود مسولینی کی ہیں۔ "ENCYCLOPAEDIA HALIANA" میں اس نے جن مقالات میں فاشزم کی وضاحت کی ہے، ان میں کہیں اس طرح کی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا اسی طرح فاشزم پر لکھنے والوں نے، جن میں اس نظریے کے مخالفین بھی شامل

ہیں، کہیں اس تصور کو پیش نہیں کیا عملی طور پر مسولینی نے صنعت اور مشینوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ ہے یہ بات دوسری ہے کہ صنعتی پیداوار اور زرعی پیداوار پر بعض پابندیاں عائد کر دی گئیں تاکہ ریاست ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ فاشزم سائنس اور صنعت کے خلاف ، بلکہ سائنسی ترقی کو مسولینی نے اپنا پڑا مقصد قرار دیا ہے۔ اقبالؒ بھی سائنسی ترقیوں کے خلاف نہیں، بلکہ انہیں ترقیوں کی وجہ سے انہوں نے یورپ کی تعریف کی ہے اور یورپ کی اس روش کو اپنانے کا مشورہ دیا ہے۔

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش جراغش روشن است

یہاں علم و فن سے مراد ظاہر ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی ہے کیونکہ یورپ کے افکار سے استفادہ کرنے کا مشورہ انہوں نے کبھی نہیں دیا یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل اشعار بھی تو کہے ہیں۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
دانی از افرنگ و از کار فرنگ
تا کجا در قید زنارِ فرنگ؟
خود بدانی بادشاہی قاہری است
قاہری در عصر ما سوداگری است
کشتنِ بے حرب و ضرب آئین اوست
مرگ ہا در گردشِ ماشین اوست

لیکن ان اشعار سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اقبالؒ مشینوں کے خلاف تھے۔ ان سے اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو مشین کا پرزہ، جذبات سے عاری اور انسانی رشتوں سے تہی مخلوق نہیں بنانا چاہتے صنعت کاری

کے دور نے غیر صنعتی ممالک کو جس طرح لوٹنا شروع کیا تھا، اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو صنعت کاری نظام اپنے ساتھ طبقاتی کشمکش اور غربا کا استحصال لاتا ہے وہ یقیناً قابل مذمت ہے اور اقبالؒ نے مندرجہ بالا اشعار میں سرمایہ دارانہ کی اسی سوداگری کی مذمت کی ہے۔ غرض نہ فاشی صنعتوں کے مخالف ہیں نہ اقبالؒ، الزام بھی اختر رائے پوری کا وضع کردہ ہے اور یہ مماثلت بھی انہیں کے تخیل کی مرہون منت ہے۔

دوسرا الزام ہے بوقت ضرورت طاقت سے کام لینا اور طاقت کی علامت شاہین ہے۔ یہاں "بوقتِ ضرورت" کا ٹکڑا بہت کچھ وضاحت طلب ہے۔ کیا دفاع کرنا بوقتِ ضرورت طاقت سے کام لینے کی ذیل میں نہیں آتا؛ اگر اختر حسین رائے پوری اس سے مراد لیتے ہیں کہ مقصد براری کے لیے کمزور پر چڑھ دوڑنا، تو اقبالؒ کے سارے کلام سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ باقی رہی شاہین کی علامت، شاہین پر اقبالؒ نے جو نظم "بالِ جبریل" میں لکھی ہے، وہ اس علامت کی بخوبی وضاحت کرتی ہے پوری نظم کے متن سے مندرجہ ذیل شعر کو الگ کر کے من مانا مطلب نکالنا آسان ہے۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اس کے ساتھ ذیل کے اشعار نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

ان اشعار کو ایک ساتھ پڑھنے سے جھپٹنا، پلٹنا وغیرہ محض دفاعی مشقیں معلوم ہوتی ہیں۔ کیا پرندے ہوا میں طرح طرح کے کھیل نہیں کھیلتے؟ کیا اس شعر سے صرف یہی مطلب نکلتا ہے کہ شاہین کسی پرندے پر جھپٹ رہا ہے؟ پھر دفاع کے لیے اپنے آپ کو اس وقت تک تیار رکھنے کی ضرورت ہے، جب تک دنیا سے طاقتور قوموں کی توسیع پسندی ختم ہو جاتی۔ ہندوستان نے جب ہم پر حملہ کیا تو ہم دفاعی اقدامات کی وجہ سے بچ گئے، ورنہ خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔

آخری اعتراض یہ ہے کہ اقبالؒ چند آدمیوں کی آمریت قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اقبالؒ نے جمہوریت کے خلاف شعر کہے ہیں، مگر انہوں نے آمریت اور دوسرے سیاسی نظاموں پر بھی تنقید کی ہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اب تک ایسا کوئی بے عیب سیاسی نظریہ وجود میں نہیں آیا، جو دنیا کے تمام لوگوں اور ملکوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہو اور شاید ایسا ہونا بھی ناممکن ہے۔ ہاں اگر تعلیم عام ہو جائے اور ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرے تو جمہوریت بہترین نظریہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس پر "بندوں کو گنا کرتے ہیں۔ تولا نہیں کرتے" والی پھبتی صادق نہیں آتی۔ لیکن جس طرح کی جمہوریت دنیا کے بیشتر ملکوں میں رائج ہے، وہ پر فریب ہے اور اس کی مخالفت بجا معلوم ہوتی ہے۔ غرض اقبالؒ کسی سیاسی نظاموں میں نہ جمہوریت سے مطمئن ہیں نہ ملوکیت اور نہ ہی آمریت سے۔ لیکن چند برگزیدہ انسانوں کی حکومت کا تصور کیا ضرور ہے کہ فاشزم سے اخذ کیا جائے جب کہ گذشتہ تین ہزار برسوں میں یہ تصور مختلف لوگوں نے اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ یہاں اختر رائے پوری یہ بھی بھول گئے ہیں کہ فاشزم کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اقبالؒ اس قسم کے بیشتر سیاسی شعر کہہ چکے تھے۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ یہ خیالات انہوں نے فاشزم سے اخذ کیے ہوں۔

یہ اعتراضات ختم ہوئے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری اور دوسرے اشتراکی نقاد فاشزم کی گالی کیوں تصور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ

نفسیاتی ہے۔ اقبالؒ اور فاشزم یا اقبال اور کمیونزم میں جو بعض مماثلتیں ہیں، وہ یا تو اتفاقی ہیں اور یا اس وجہ سے ہیں کہ یہ سب نظریے کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں البتہ تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ کمیونزم اور فاشزم میں بڑی گہری مماثلتیں ہیں۔ سولینی خود پہلے اشتراکی تھا، لیکن بعد میں وہ اشتراکیت کا مخالف ہو گیا۔ اس لحاظ سے دونوں سیاسی نظاموں کی ساخت میں ایک ہی طرح کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

دونوں نظریات بعض چیزوں کو جزو ایمان قرار دیتے ہیں، مثلاً سلطنت، لیڈر یا نسلی برتری۔ فاشزم اور کمیونزم حکومت سے اختلاف کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ دونوں میں حکومت فردِ واحد کے ہاتھ میں رہتی ہے، جس کی ذات تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں اس لطیفے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مسولینی کے دورِ حکومت میں ہر جگہ اس کی تصویریں آویزاں کی جاتی تھیں اور نیچے نمایاں طور پر لکھا جاتا تھا "یاد رکھیے! مسولینی ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے" یہی کیفیت روس میں لینن، سٹالن وغیرہ کی رہی اور چین میں ماؤزے تنگ کی۔ فاشزم نے نسلی برتری کے جذبے کو ابھارا۔ روس نے شاید اس لیے یہ کام نہیں کیا کہ اس نے قدیم زمانے میں دنیا کی تہذیب کو کبھی متاثر ہی نہیں کیا البتہ چینی کمیونزم نے اس خیال کو پھیلایا کیونکہ چینیوں نے دنیا کی تہذیب کو بہت کچھ دیا ہے۔

کمیونزم اور فاشزم دونوں نظریوں میں لوگوں کے ذاتی خیالات اور انفرادیت کو اس حد تک دبا دیا جاتا ہے کہ وہ محض حکومت کے ٹیپ ریکارڈز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فاشی اور اشتراکی حکومتیں دونوں اخلاقی ضوابط کے بجائے مصلحت کی قائل ہیں اور ہر طرح کے قریب سے حصولِ مقاصد کو برا خیال نہیں کرتیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سٹالن اور مسولینی ابتدا میں یورپ اور افریقہ کی بندر بانٹ میں ساجھے کے شریک رہے۔ اس وقت اشتراکیوں کو فاشزم کی برائیاں نظر نہ آئیں، کیونکہ ان کے مفاد تقاضا یہی تھا۔ اگر دوسری

جنگ عظیم کے زمانے میں ہٹلر اور روس کی بگڑ نہ جاتی، تو دونوں ملک مل کر دنیا کو ہڑپ کر جاتے۔ ہٹلر سے آخر جھگڑا کس چیز کا تھا۔ فقط بلقان کے علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد ان کی تقسیم کا اور وقتی مفاد پرستی۔ اس سے ظاہر ہے کہ روس نے اس جنگ میں اپنے فائدے کے لیے سرمایہ داروں اور سامراجی ملکوں کا ساتھ دیا۔ غرض نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دونوں نظریے بنی نوع انسان کو اپنے خیال میں بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچانے کی خاطر ان پر بعض ناروا پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ اور اس کام میں کمیونزم اور فاشزم میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔

جب اشتراکیوں اور فاشیوں میں اس قدر بنیادی مماثلتیں ہیں، تو آخر فاشزم کو ہمارے ترقی پسند گالی کے مترادف کیوں سمجھتے ہیں؟ میری رائے یہ ہے کہ دونوں نظریات کے پیروکاروں کے تنازعے کو سوکنوں کے جھگڑے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ایسی سوکنیں، جن میں ایک جیسی خامیاں موجود ہیں، لیکن دوسری کی خامیاں تو نظر آ جاتی ہیں، مگر خامیوں کی طرف سے آنکھ بند ہی کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ جھگڑا کیسے جاری رہ سکتا ہے۔ ان سوکنوں کے جھگڑے کو سننے والا کوئی غیر جانب دار شخص ہی کہہ سکتا ہے کہ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ چونکہ فاشزم نے کمیونزم کی مخالفت کی تھی، اس لیے اختر حسین رائے پوری فاشزم کو گالی بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم اور فاشزم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور اگر اقبالؒ اور فاشزم کے بارے میں انہی کا فقرہ کمیونزم اور فاشزم پر محاکے کے طور پر پیش کیا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوگا کہ "دونوں کا قالب الگ ہو سکتا ہے مگر روح ایک ہی ہے"۔ باقی رہے اقبالؒ، تو ان کے نظامِ فکر میں روحانیت، اخلاق اور مذہب کے عناصر ہی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فاشزم یا کمیونزم سے انہیں کوئی ربط و تعلق اور ردّ و رد کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

تصوّرِ رجائیت

زندگی میں[1] ہر انسان کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن بلند ہمت انسان ناکامیوں سے بددل نہیں ہوتے، بلکہ ہر ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ سمجھ کر اپنی کوششوں کو پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دیتے ہیں اور آخر کار کامیابی ان کے قدم چومتی ہے یہ اندازِ فکر جو انسان کو بددل ہونا نہیں سکھاتا، بلکہ زندگی کے کھردرے حقائق سے نبرد آزما ہونے کا اس میں حوصلہ پیدا کرتا ہے، رجائیت کہلاتا ہے رجائیت کو ہم زندگی کا ایک مثبت رویہ کہہ سکتے ہیں، جو انسان کو نامساعد حالات میں جینا سکھاتا ہے۔

رجائیت کے برعکس زندگی کے بارے میں ایک اور بھی انداز فکر ہے، جو قنوطیت کہلاتا ہے۔ یہ انسان کو زندگی کے تلخ اور کھردرے حقائق سے ٹکرانے کی سکت عطا کرنے کی بجائے اسے فرار کی راہ دکھاتا ہے۔ اس رویے میں مایوسی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

اقبالؒ نے اس کے مرکزی اور بنیادی عنصر ناامیدی کو زندگی کے لیے سم قاتل قرار دیتا ہے۔

مرگ را ساماں ز قطع آرزو است
زندگانی محکم از لاتقنطوا است

---

[1] استفادہ از "اقبال شناسی اور محور"، مؤلفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مقالہ از اختر پرویز ص ۱۳۸۔

نا اُمید از آزر روئے پیم است
نا امیدی زندگانی را سم است

کہ اقبالؒ نے اپنی قوم کو کہیں بھی مایوسی کا درس نہیں دیا اور نہ خود قوم ہی سے مایوس ہوئے ہیں۔

نہیں ہے نا اُمید اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن، بے ذوق نہیں راہی

اقبالؒ اس دور میں بھی روشن مستقبل ہی قوم کو دکھاتے رہے۔ جب مسلمانانِ عالم کی سیاسی و معاشرتی حالت بہت مایوس کن تھی۔ ترکی کی سلطنت جو مسلمان قوم کی عظمت اور جاہ و جلال کی علامت بہت کمزور ہو چکی تھی مغرب کی سامراجی قوتوں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے کئی زرخیز علاقے ہتھیا لیے۔ جنگِ عظیم اول کے بعد ترکی مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی، اس نے اقبالؒ جیسے رجائیت کے علمبردار کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ ۱۹۲۲ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں اقبالؒ "خضرِ راہ" پڑھتے ہوئے، جب مندرجہ ذیل شعر پر پہنچے تو عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ[۲۱]
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

لیکن ان حالات میں بھی اقبالؒ مایوسی کا درس نہیں دیتے بلکہ مسلمانوں کو ایک روشن مستقبل کی تصویر دکھاتے۔ "شمع و شاعر" بھی اسی مایوسی کے دور کی نظم ہے، جس کے نصفِ اول میں اقبالؒ کی افسردگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

وائے ناکامی، متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لیکن آخر یہ نظم بھی امید و خوشی کے پیغام پر ہی اختتام پذیر ہوتی ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اسی طرح "خضرِ راہ" بھی انتہائی یاس انگیز ماحول میں لکھی گئی جب ہر طرف مسلمان مصائب کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے قسطنطنیہ پر اتحادی قابض ہو چکے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی شریفِ مکہ کی وجہ سے دمشق اور بغداد جیسے مقدس علاقے دشمنوں کے ہاتھوں چلے گئے۔ ادھر ہندوستان میں تحریک خلافت کے نتیجے میں سیکڑوں مسلمان قید ہوئے، لیکن اقبالؒ قوم کو یہاں بھی مایوس ہونے کے بجائے درخشاں مستقبل کی جھلک ہی دکھلاتے ہیں۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلمان، آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

اقبالؒ مایوس کن حالات میں نہ تو خود مایوس ہوتے ہیں اور نہ مایوس

کا پیغام دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مایوس اور قنوطیت ان کے نصب العین اور پیغام کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا پیغام جدوجہد اور سعیِ مسلسل ہے۔ وہ اسی کو کامیاب زندگی کا راز سمجھتے ہیں۔ یہ جدوجہد اور جستجو آرزو کی مرہونِ منت ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

وہ اس جستجو کے دائرہ کار کو محدود نہیں بناتے۔ انسان کو صرف اس مادی دنیا کی تسخیر ہی نہیں کرنی، بلکہ ستاروں پر کمند بھی ڈالنا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

انسان اُن کے بنیادی پیغام عمل اور جستجو پر اسی وقت عمل پیرا ہوگا جب وہ اپنے مستقبل کی درخشاں تصویر دیکھے گا۔

اقبال مسلمان قوم کو اس دنیا میں خدا کا آخری پیغام سمجھتے ہیں، اس لیے وہ اس کے مٹنے اور فنا ہونے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں بنی نوعِ انسان کی رسوائی ہے۔

میری ہستی پیرہن عریانیِ عالم کی ہے میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم ہے

انقلاب کی کشمکش قوموں کی زندہ رکھتی ہے۔ یہ بے حسی اور جمود کو توڑ کر قوموں میں تحریک کا احساس پیدا کرتی ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کس مکشِ انقلاب

اقبال مسلمانوں کے زوال کو ان کے عروج کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔

اسی لیے تو وہ ترکوں کے مصائب کو ان کی کامیابی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

غرض اقبالؒ کا فلسفہ رجائیت امید اور قوت کا فلسفہ ہے، جو کامیاب انسانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

(از جناب اختر پرویز)

تصوّرِ انسانِ کامل

کلامِ اقبالؒ میں انسان کامل ابتدا مردِ خود آگاہ اور بندہ درویش اور پھر بندہ مومن یا مردِ قلندر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اقبالؒ کا بندہ مومن بھی قریب قریب، انہیں صفاتِ حمیدہ کا حامل ہے، جو ایک مردِ فقیر میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ بندہ مؤمن کو اللہ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اقبالؒ بندۂ مومن کو اس مادی دنیا تک محدود نہیں سمجھتا:

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مؤمن

وہ ایک اور نظم میں مومن کے استقلال، عزم اور استقامت کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

۱؎ استفادہ از "اقبال شناسی اور محور" از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مقالہ محمد معصوم عابدی۔

غرض کہ اقبالؒ کا بندۂ مومن بھی مادیت پرستی، سرمایہ داری اور ظلم و تشدد کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور کسی بھی زاویے سے سرمایہ داری کا شکار نہیں ہے۔

کلامِ اقبال میں موجود سب تصورات باہم دگر اس طرح مربوط ہیں کہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا تصورِ فرد و ملّت ہو یا تصورِ خودی، تصورِ فقر و عشق ہو یا تصورِ انسانِ کامل، تصورِ حسن ہو یا تصورِ معاشرت، تصورِ معیشت ہو یا تصورِ سیاست، سب کے سب ایک مثالی فرد کے گرد گھومتے ہیں اور اس کا یہ مثالی فرد ایثار و خلوص کی تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔

اقبالؒ سرکارِ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا انسانِ کامل سمجھتا ہے، جس کی پیروی ایک عام فرد کو مثالی فرد بنا کر اس کے سر پر ابدیت کا تاج سجا دیتی ہے۔ مثلاً حضرت بلالؓ حبشی کے متعلق لکھتا ہے۔

اقبالؒ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے؟
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے!

ایک اور جگہ اس طرح کہتا ہے۔

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسین ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

اس حسین کو جو مجموعۂ حسنِ کائنات ہے، اقبالؒ انعاسِ عفو کی منزل پر فائز دیکھتا ہے۔ شخصی یا ذاتی ملکیت کا تصور تک اُس کی حیاتِ طیبہ میں نہیں جھلکتا حالاتِ وقت کے مطابق دوسروں کو نصابِ زکوٰۃ کا درس دینے والا اسلامی حکومت کا سربراہ ہونے کے باوجود پوری زندگی میں کبھی اس قابل نہیں ہوتا کہ خود صاحبِ زکوٰۃ بن جائے۔ یہی اس کی اور اس کے پالنے والے کی پسندیدہ ترین صورت ہے۔ یہی اس کا وہ مقصودِ نظر ہے، جسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام ماننے والوں کی زندگیوں میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ منزل "قل العفو" ہے

جس کی طرف اقبالؒ نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبالؒ کے ہاں، قرآنی قانونِ وراثت کسی ملکیت کی توثیق کے لیے نہیں بلکہ بتدریج ملکیت کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ اقبالؒ کے عزائم کی راہ میں سرمایہ داری کا بھوت ایک خطرناک رکاوٹ ہے۔ اسی لیے وہ اس نظامِ معیشت کے خلاف اپنے کلام میں مصروفِ جہاد ہے۔ معاشی سرمایہ داری کی بجائے وہ انسانوں کو قلب و نظر اور ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔

زندگانی سوختن یا ساختن
در گلے۔ دے انداختن

(محمد معصوم عابدی)

تصوّرِ شاہین

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن کو شاہین کے خطاب سے نوازا ہے۔ شاہین کا کام فضائے بے کراں کو وسعتوں میں پرواز کرنا ہے۔ اگر ایک آسمان کی پہنائیاں اس کی پرواز کے لیے ناکافی ہوں تو وہ دوسرے جہاں کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔ آرام طلبی اور کارآشیاں بندی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ کوہ و بیاباں اور فضائے آسماں اس کی جولانیوں کا مرکز ہیں ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلّت ہے کارآشیاں بندی

کارِ آشیاں بندی سے مراد دنیا کے جنجال میں پھنسنا، حیاتِ دنیا کو مقصود بنانا اور اپنے مقصد سے منہ موڑ کر آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا ہے اور یہ دونوں مقاصد اس کی زندگی سے خارج ہیں۔

اقبالؒ کا شاہین اسباب و علل کی دنیا سے اس قدر بے نیاز ہوتا ہے کہ اندلس کے ساحل پر جہاں پیچھے سمندر اور آگے دشمن کا ملک ہے، بے باکانہ اپنے جہاز جلا دینے کا حکم دے دیتا ہے اور جب واپسی کے دروازے بند کرنے پر اسے توجہ دلائی جاتی ہے تو تیغِ دو دم کو ہاتھ میں تھام کر مسکراہٹ

؎ استفادہ از اندازِ بیان مولفہ عبداللہ شاکر ص ۱۱۲

کے پھول بکھیرتا ہوا پورے عزم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ ؏

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یہ جہانی نظریہ، یہ آفاقی وسعتِ خیال اس کی زندگی کا جلال و جمال ہیں اور یہی جلال و جمال اسے وہ ملکوتی پَر عطا کرتے ہیں جن کے آگے آسمان کی پہنائیاں سمٹ کر رہ جاتی ہیں، بلکہ عرشِ بریں بھی رہِ یک گام بن جاتا ہے ؎

رہِ یک گام ہے ہمّت کے لیے عرشِ بریں

کہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات

خدا کی زمین پر خدا کی حکومت اس کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ محض ایک خطۂ زمین مانگتا، بلکہ پوری کائنات کی سروری کا مطالبہ کرتا ہے، تاکہ اللہ کے بندوں پر اللہ کی حکومت قائم ہو سکے اور دنیا امن و راحت کی بہاروں سے بہرہ یاب ہو سکے ؎

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب

تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار

طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر

اس کی جد و جہد دنیا میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجانے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ اس کی سعی و جہد کا محور ہوتا ہے ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب، یہ پچھم چکوروں کی دنیا

میرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

وہ صاحبِ امروز ہے جو زمانے کے سمندر سے گوہرِ فردا نکالتا ہے۔ وہ عصرِ حاضر کی تاریکیوں کو دور کرنے والا چاند ہے۔ وہ ظلمتِ شب کا سینہ چاک

کر کے نکلنے والا نیّرِ تاباں ہے، نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز اس کا رختِ سفر ہے اور اسی متاعِ بے بہا کو ساتھ لے کر وہ برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور دنیا خود بخود اس کے قدموں پر نثار ہونے کے لیے کھنچی چلی آتی ہے۔

وہ مردِ مومن آج بھی موجود ہے مگر زنگ آلود تلوار کی طرح منجمد اور پابستہ دریا کی طرح اور اس شیر کی طرح جو بھیڑوں میں پرورش پا کر اپنی شیری ہی بھول چکا ہو ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں

اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

اسے اپنی اصلیت سے آگاہ ہونا چاہیے، کیونکہ جب تک وہ اپنی حقیقت سے بے خبر رہے گا منزلِ مقصود کا سراغ اس کی نگاہ سے اوجھل ہی رہے گا ؎

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

اسے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کے لیے ہے ؎

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا

ناخدا تُو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تُو

وائے ناکامی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا

مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو محفل بھی تُو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے

تُو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

(عبداللہ شاکر)

تصوراتی سفرِ مدینہ منوّرہ

اقبالؒ عمر بھر حجاز کے سفر کی تیاریاں کرتے رہے ہیں اور عمر بھر تصوراتی طور پر مسافرِ مدینہ رہے ہیں ان کے اندر رسول اکرمؐ کا عشق ٹھاٹھیں مارتا رہا ہے اور جدائی کے لمحات ذہنی سفر میں گزارتے رہے ہیں۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامان اوست — بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

یہ عشقِ مصطفیٰؐ اقبال کے دل کا منتقل سوز ہے یہ ان کی زندگی کو سوز و ساز کی لازوال دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی کے خاموش سازمیں اسی عشقِ رسولؐ کے شور کو موجود پاتے ہیں، اسی کے سبب سے بے شمار نغمے ان کی آغوش میں تڑپتے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اسی معشوق کے آئینہ سے ان کے پیکر کی تخلیق اور اسی کے آفتاب سینہ سے ان کی صبحِ زندگی روشن ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک مدینہ کی خاک دونوں جہاں سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ شہر بابرکت ہے جس میں ان کا معشوق موجود ہے۔

شورِ عشقش در نے خاموشِ من — می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

مدینے کی طرف سفر اور حاضری کے لئے اقبالؒ کی شیفتگی بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنے آقاؐ کو پیام دیتے ہیں کہ مجھے اپنے دربار میں طلب فرمالیجئے کیونکہ میں آپ کے ہجر میں نالاں ہوں اور مسلسل نغماتِ درد سے میری روح بے چین ہو گئی ہے۔!؎

اے کہ دادی کردرا سوزِ عرب — بندۂ خود را حضورِ خود طلب

جاں ز مہجوری بنالد در بدن — نالۂ من وا لے من! اے وائے من
بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے — تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے

یہ عشق شدید تر ہوتا جاتا ہے اور انہیں کسی پہلو قرار نصیب نہیں ہوتا۔ وحشتِ دل فزوں تر ہوتی ہے اور وہ اپنے دل کو بہلانے کے لیے کوہ و صحرا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی افسردگی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے وہ آبجو کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں اور زار و قطار رونے لگتے ہیں۔

ندانم دل شہیدِ جلوہ کیست — نصیب او قرار یک نفس نیست
بصحرا بر دمش افسردہ ترگشت! — کنار آبجوئے زا۔ بگریست!

پھر وہ یثرب کے لیے رختِ سفر باندھتے ہیں۔ سرورِ عشق و مستی میں گنگنا شروع کرتے ہیں اور انہیں اس تھکے ہوئے پرندے کی طرح کیف حاصل ہونے لگتا ہے جو شام کے وقت آشیانہ کی طرف لوٹ جانے کے لیے اپنے پر کھول دیتا ہے۔

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نواخواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ذہنی طور پر یثرب کا یہ سفر رہتا ہے۔ کارواں منزل بہ منزل چلا جاتا ہے۔ ہر شخص مسرور ہے یہاں تک کہ قافلے کے اونٹ بھی یثرب کے ذوق و شوق سے معمور نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ ضعیف ہیں۔ بیمار اور تھکے ہوئے ہیں لیکن ان کی اونٹنی کے قدم تیز تر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اسے کہتے ہیں کہ ذرا آہستہ چل۔ مگر یہ سُن کر اس کے قدم اور بھی مستانہ وار اٹھنے لگتے ہیں جیسے کہ اس کے پیر کے نیچے صحرا کی ریت ریشم و پرنیاں کی طرح نرم ہو گئی ہو۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو — کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی! — بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است

اس بات پر شاید ساربان متوجہ ہو کر اونٹنی کو مہار دینا چاہتا ہے۔ لیکن اقبالؔ اس سے کہتے ہیں کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اونٹنی کی روح بھی ہماری روح کی طرح دیدارِ محبوبؐ کر رہی ہے مجھے اس کی رفتار ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی میری

طرح دل کے طلسم میں اسیر ہے۔

مہاراے ساربان ادرا نشاید — کہ جانِ او چو جانِ ما بصیر است
من از موجِ خرامش می شناسم — چو من اندر طلسمِ دل اسیر است

وہ محسوس کرتے ہیں کہ اونٹنی کی چشمِ سیاہ میں آنسوؤں کی نمی موجود ہے۔ اس کی آہِ صبحگاہی سے میرا دل بھی جل رہا ہے۔ وہی شرابِ عشق جس سے میرا ضمیر روشن ہو گیا ہے اس کی موجِ نگاہ سے پے بہ پے ٹپک رہی ہے۔

نم اشک است در چشمِ سیاہش — دلم سوزد ز آہِ صبح گاہش
ہماں مے کو ضمیرم را برافروخت — پیاپے ریزد از موجِ نگاہش

عرب کا خشک صحرا بھی مبارک ہے کہ جس کی ہر ساعت دل نواز اور فرحت انگیز ہے۔ اس کی راتیں چھوٹی ہیں، دن بڑے ہیں اور شام صبح خند ہے اس کے ذرّہ ذرہ سے یثرب کے باسی کا عشق منعکس ہوتا ہے۔ اس لیے اقبالؒ اپنے ہمرہانِ سفر سے کہتے ہیں کہ ان مقدس ذرّوں کا لحاظ کریں، ان کی دردمندی کا احترام کریں اور اپنے قدم ان پر آہستہ آہستہ رکھیں۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است — شبش کوتاہ و روزش دلپسند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ — چو ماہر ذرّۂ او دردمند است

کارواں جھومتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہر شخص عشقِ محمدیؐ سے سرشار اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے اور اقبال حالتِ وجد میں ہیں کبھی وہ عاشقانہ کلام پڑھتے ہیں اور کبھی اپنے محبوبؐ کی شان میں اشعار کہنے لگتے ہیں۔ اس پر لوگ امیرِ کارواں سے پوچھتے ہیں کہ یہ غیر عرب کون ہے؟ اس کا سرود عربی اگرچہ نہیں ہے تاہم اس خشک صحرا میں بھی اس کے نغموں سے دلوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔

امیرِ کارواں! آں اعجمی کیست؟ — سرودش با آہنگِ عرب نیست!
زند آں نغمہ کز سیرابیٔ او — خنک دل در بیابانے تواں زیست!

اقبال کو اس سفر کا سوز و ساز پسند آتا ہے۔ غمِ جدائی کے شعلوں میں انہیں لطف

آنے لگتا ہے۔ اس لیے وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ مجھے درِ یارؐ تک کسی طویل راستہ سے لے چل۔ جدائی کے ان شعلوں کو تیز تر اور میری آہ و فغاں کو جنوں انگیز تر کر دے۔

غم راہی نشاط امیز تر کن — فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے ساربان راہ درازے — مرا سوزِ جدائی تر کن!

اور پھر اپنے محبوبؐ کی یاد سے ان کا دل بھر آتا ہے، جگر میں تیر سا لگتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے ساتھی سے کہتے ہیں کہ اے ہم نفس! آ کہ ہم مل روئیں کیونکہ ہم دونوں آقائے مدینہ کی شانِ جمال کے شہید ہیں۔ آ کہ ہم اپنے محبوبؐ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے دل کی باتیں کہیں دردِ جگر کا اظہار کریں اور اس کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملیں۔

بیا اے ہم نفس با ہم بنالیم — من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم! — بپائے خواجۂ چشماں رابمالیم

سچا عشق اپنا اثر رکھتا ہے۔ جذبِ دل محبت کا بہترین تیقن ہے اور سوزِ دروں سے کامیابی کی اعلیٰ ترین ضمانت ہوتی ہے۔ اقبالؒ کی صدا دربارِ مدینہ کی دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ ان کی فغاں سلطانِ مدینہؐ کے دل پر اثر کرتی ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟ پھر اس دربار کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اس دربار کے دروازے ایک درویش کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے فلسفیوں کی کچھ پیش نہیں جاتی، جہاں بڑے باجبروت شہنشاہ لرزہ براندام ہوتے ہیں اور جہاں جنید و بایزیدؒ نفس گم کردہ داخل ہوتے ہیں۔

حکیماں را بہا کم تر نہادند — بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے — درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

اس دربار میں داخل ہوتے ہی اقبالؒ کو عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔ یہاں بقائے دوام ہے۔ یہاں فانی انسانوں کو حیاتِ جاودانی بخشی جاتی ہے، اسرارِ حیات کو منکشف

اور حقائق کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ یہاں مسند نشینؒ کی نگاہوں کا فیض ہر شخص کے لیے جاری ہے اور حکیم ہو یا کلیم، دیدار کی اجازت ہر شخص کے لیے موجود ہے ؎

دریں وادی زمانی جاودانی — زخاکش بے صور دید معانی
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش — کہ ایں جا کس نگوید "لن ترانی"

اس بارگاہ میں صوفی بھی ہیں اور فلسفی بھی، امیر بھی ہیں اور فقیر بھی، متقن بھی ہیں اور مؤرخ بھی۔ کوئی لغت خوانی میں مصروف ہے، کوئی مسائلِ حیات پر اکتسابِ نور کر رہا ہے اور کوئی حال درد دل سنا رہا ہے۔

اہل کارواں نہایت ادب سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں مجلس نبوی میں پہنچ کر اقبالؒ کے جذبات اپنے محبوبؐ کے دیدار سے ابھر آتے ہیں۔ شعلۂ عشق بھڑک اٹھتا ہے اور وہ زار و قطار لگتے ہیں رونے کا سبب دریافت فرمایا جاتا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ یہ صورت حال آپؐ ہی کے غم عشق کا نتیجہ ہے۔ اسی غم سے میرے دل کی حرارت، اسی سے میری نوا میں اثر اور اسی سے میرے ضمیر کی روشنی ہے اور میں اس لیے روتا ہوں کہ ملک ہند میں ایک شخص بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو آپؐ کا محرم ہو ؎

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تُست — نوائے من ز تاثیر دمِ تُست!!
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند — ندیدم بندۂ کو محرمِ تُست

اقبالؒ اپنی غیر متزلزل محبت کو واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ آپ ہی میرے خیالات کا محور اور میری امیدوں کا مرکز ہیں۔ آپؐ ہی میری زندگی کا مقصد اور میری حیات کا سہارا ہیں میں اپنا افسانۂ غم کس کو سناؤں کہ میرے سینے میں آپؐ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے ؎

دردِ ما بجز درد دلِ نفس نیست — بجز دستِ تو مارا دسترس نیست
دگر افسانۂ غم با کہ گویم — کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست

پھر اس بارگاہِ رسالتؐ پناہ میں اپنے حالات بیان کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اپنے لیے کسی اور کی مدد تلاش نہیں کرتا کیونکہ آپؐ ہی کے آفتاب کے فیض سے

میرے ارتقاء کا عمل جاری ہے اور میری اس بے نیازی اور خود داری کے باعث میری نگاہ ماہ و پرویں سے بلند تر ہو گئی ہے۔ ا ؎

نم و رنگ از دمِ بادے نجویم — ز فیضِ آفتاب تو بر دیم
نگاہم از مہ و پرویں بلند است — سخن را بر مزاج کس نگویم

اور آپؐ کے حکم کی محض تعمیل میں مکہؐ کی راہ میں نے اختیار کی ورنہ آپؐ کے سوا میری اور کوئی منزل نہیں ہے ؎

تو فرمودی رہ بطحا گرفتم — گرنہ جز تو مارا منزلے نیست

اس لیے مجھے اپنے دربار سے نکال نہ دیجئے کہ میں آپؐ کا مشتاق ہوں اور درد عشق کے باعث بیقرار اور ناصبور ہو گیا ہوں۔ آپؐ صبر کے علاوہ مجھے ہر حکم دے سکتے ہیں کیونکہ آپؐ کے ہجر میں صبر میرے بس کی بات نہیں ہے ؎

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم — ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہر چہ می خواہی بجز صبر — کہ ما از دے دو صد فرسنگ دوریم

اور میں آپؐ کو چھوڑ کر کہاں چلا جاؤں کہ ساری دنیا تو عشق سے پیدا ہوئی ہے لیکن نورِ عشق کی تخلیق آپؐ کے سینہ سے ہوئی ہے اور خود جبرئیلؑ بھی آپؐ ہی کے آئینہ کا ایک جوہر ہے ا ؎

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تُست — سرورش از مے دیرینۂ تُست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبرئیلؑ — کہ او یک جوہر از آئینۂ تُست

اور حضورؐ میں نے علمِ حاضر کے طلسم کو توڑا ہے، اس کے دام کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ اس علم کے شعلے بھڑکتے رہے ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ میں ان شعلوں پر حضرت ابراہیمؑ کی طرح بے پروا بیٹھا رہا ہوں ؎

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خداوندا کہ مانندِ ابراہیمؑ — بنارِ او چو بے پروا نشستم

میں اپنے سن شعور ہی سے آپؐ کے نور سے استفادہ کر رہا ہوں میں نے ابتداء

ہی میں آپؐ کے نور سے اپنے مقام کو دیکھا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اس بتخانہ میں اپنی نوائے صبحگاہی سے میں نے ایک جہان عشق و مستی تعمیر کر لیا ہے! ؎

چو خود را در کنارِ خود کشیدم — بہ نورِ مقامِ خویش دیدم
دریں دیرِ از نوائے صبحگاہی!! — جہانِ عشق و مستی آفریدم

مری روح کی تپش آپؐ ہی کے کرم کی مرہونِ منت ہے، میری فکر کا پیچ و تاب آپؐ ہی کی نگاہ لطف کا پیدا کردہ ہے، میرے دل کی بیقراری آپؐ ہی کے دم کا فیض ہے اور تک زندگی میں موجِ شراب آپؐ ہی کے زمزم سے آئی ہے اور چونکہ میرا دل آپؐ کا رازدار ہے اس لیے تمام مادّی قدریں میری نظر میں بدل گئی ہیں اور ملکِ جمشید میری درویشی سے شرمندہ ہونے لگا ہے۔! ؎

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تُست — بتاکم موجِ مے از زمزمِ تُست
خجل ملکِ جم از درویشیٔ من — کہ دل در سینہ من محرمِ تُست

میں تلاشِ محبوب میں ساری دنیا میں گھومتا رہا ہوں۔ اپنے دل کو ہتھیلی پر رکھ کر صحراؤں کی خاک چھانتا رہا ہوں، موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہا ہوں، لیکن مجھے کوئی دلبر نصیب نہ ہو سکا، میرے دل کی دولت کو لوٹنے والا کوئی غارت گر مجھے نہیں مل سکا۔ اور اب سینۂ سوزاں کو لیے ہوئے آپؐ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ اس لیے میرے سینہ میں آیئے اور یہاں قیام کیجئے، میرے بیچین دل کو سکون عطا کیجئے، میری تنہائی پر رحم کیجئے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی مسلمان مجھ سے زیادہ تنہا نہیں ہے۔ ؎

دلے بر کف نہادم، دلبرے نیست — متاعے داشتم، غارتگرے نیست
درونِ سینہ من منزلے گیر! — مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

محبت کی کیفیت اور عشق کی داستان سنانے کے بعد اقبالؒ اپنے محبوبؐ کی بارگاہ میں اپنی نذر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے میرے محبوبؐ! ہندوستان سے طویل سفر طے کر کے آیا ہوں اور ایک ادنیٰ نذر بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ نذر

کیا ہے؟ — آپؐ کی دہلیز کے لیے یہ میرا سجدۂ ذوق و شوق ہے جو محبت کی شدت کے باعث میری پیشانی میں خون بن کر رہ گیا ہے۔ ؎

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام — سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من!

ایک اور حقیر تحفہ بھی آپؐ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں میرا خون موجود ہے۔ میرا خون بہت اثر آفریں ہے۔ یہی میرے جنونِ عشق کا باعث ہے اور اسی سے قبائے لالہ رنگین ہو گئی ہے — یہ تحفہ کیا ہے! یہ میرا دل بیقرار ہے، میری زندگی کی متاع، میری کاوشوں کا حاصل اور میری محبت کا جوہر ہے۔ خدارا اسے قبول کیجئے، اس غلام کو سرفراز فرمایئے کہ اس کے پاس متاعِ دل کے سوا کچھ اور موجود نہیں ہے۔ ! ؎

دمیدہ آں لالہ از مشتِ غبارم — کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہِ دل نوازی — کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

اقبالؒ کی یہ نذر پیش ہوتی ہے، ان کے تحفہ کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا ہے اور ان سے ان کی مراد پوچھی جاتی ہے۔ اس پر اقبالؒ کے دل میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! آپؐ کا ظہور حیات کا شباب ہے اور آپؐ کا جلوہ خوابِ زندگی کی ایک نئی تعبیر ہے۔ آپ کا وجود کائنات کا قیمتی سرمایہ ہے جس سے اس کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے — اور جب سے میری نظر آپؐ کے چہرۂ مبارک پر پڑی ہے آپؐ میرے والدین سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں آپؐ کے درشن سے میری روح میں تپش ہوئی ہے۔ میرے عشق کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور میرے سینے میں آگ لگ گئی ہے — آپؐ کی نظرِ کرم حیوان کو بھی انسان بنا سکتی ہے، اس لیے حضورؐ میرے حق میں یہ دعا کیجئے کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہو جائے تاکہ میں جو قطرۂ آب نیساں ہوں آپؐ کے طفیل سے گوہرِ بیش بہا بن جاؤں۔ ؎

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
از تو بالا پایہ ایں کائنات — فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
تا مرا افتاد بر رویت نظر — از شبابِ دام گشتہ محبوب تر

عشق در من آتشے افروخت است — فرمتش باد اکہ جانم سوخت است
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است — یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل — عشقِ من گرد و ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا — آب نیسانم گہر گرداں مرا

میری خاک میں شرر پنہاں ہیں، میری آہِ سحر کا سلسلہ جاری ہے اور میں ایک نگاہِ برق انداز کا آرزو مند ہوں۔ اس لیے مجھے آزمائیے، میری آنکھوں پر اپنی تجلّی کو مرکوز فرمائیے اور دیکھئے کہ اس ضعیفی کے باوجود مجھے تابِ نظر حاصل ہے۔ ؎

ہمنورا ایں خاک دارائے شرر ہست — ہمنورا ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلّی ریز بر چشمم کہ بینی —— بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

اس نوبت پر اقبالؒ ذرا آگے بڑھتے ہیں اور اس محفلِ مئے عشق میں ساقیؐ سے قریب تر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ اے ساقی! محبّت کی شراب مجھے دیجئے جامِ شراب کو گردش میں لا کر سوز نے میں اضافہ کیجئے اور میرے سینے میں ایسا دل رکھ دیجئے کہ جس کی بدولت میں کاؤس اور کیقباد کا پنجہ موڑ سکوں! ؎

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را — زمے سوزندہ تر کن سوز نے را
دگر آں دل بنہ در سینۂ من — کہ پیچم پنجہ کاؤس و کے را

مئے عشقِ مصطفےٰ نوش کرنے سے اقبالؒ کا دماغ روشن تر اور ذہن تیز تر ہو جاتا ہے معاً ان کے لہجے میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے اور وہ بارگاہِ رسالتؐ پناہ میں رموزِ کائنات پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے دنیا کو لا الٰہ کی تعلیم دی ہے۔ یہی لا الٰہ کائنات کی بنیاد اور اس کا جوہر ہے۔ اسی سے سوز و سرور کا لطف ہے اور اسی سے انسان کے اندیشے رفیع اور تاریک خیالات روشن ہو جاتے ہیں۔

لذّتِ سوز و سرور از لا الٰہ — در شبِ اندیشہ نورِ الٰہ!

لیکن اس لا الٰہ کی عملی مشکلات بے شمار ہیں۔ اسی سبب سے جب میں خود کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ تاہم آپؐ ہی کے نور سے اپنی نگاہ کو روشن کرتا

ہوں جس کی بدولت میں لا الٰہ کی حقیقت تک بھی پہنچ سکتا ہوں اور رموزِ کائنات کو بھی سمجھ سکتا ہوں۔! ؎

بنورِ تو برافروزم نگہ را — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

نورِ مصطفےٰ کے فیضان سے اقبالؒ کے قلب و نظر مستنیر ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے آقا! میری آنکھوں کو آپ ہی نے نگاہ بخشی ہے۔ لا الٰہ کی تابناکی آپؐ ہی نے مجھے عطا کی ہے اور میری شبِ زندگی میں چاند کی روشنی آپؐ ہی کی لائی ہوئی ہے۔ اب مجھے آپؐ کا رخِ زیبا دل بھر کر دیکھ لینے دیجیے۔ کیونکہ آپؐ کو دیکھنا خدا کو دیکھنے کے مترادف ہے۔! ؎

بچشمِ من نگہ آوردہ تُست — فروغِ لا الٰہ آوردۂ تُست
دو چار م کن بر صبحِ "من راتی" — شبم را تابِ مہ "مہ دردۂ تُست

"لا الٰہ" بے پناہ قوّت کا حامل ہے۔ برق کی اس میں تیزی ہے اور جوہر کی توانائی اس میں موجود ہے اس کے صحیح استعمال میں بڑے بڑے ہنگامے پوشیدہ ہیں اور بے شمار انقلابات کا یہ امین ہے۔ اس لیے تیغ لا، میرے ہاتھ میں دیجئے اور پھر دنیا میں "الّا" کے اثرات کو دیکھئے ؎

تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ — باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّا ئے من

"لا الٰہ" کے رموز کو میں سمجھ رہا ہوں اور "الّا اللہ" کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ آپؐ کی ذات اس کی روحِ رواں ہے۔ آپؐ نے خود کو "عبدہٗ" یعنی بندۂ حق کہا ہے "عبدہٗ" دراصل کلمۂ توحید کا جوہر ہے کیونکہ حدیثِ قدسی کے مطابق بندۂ حق ذکر و عبادت میں محویت کی بدولت اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں خدا کی آنکھ اس کی آنکھ اور خدا کی زبان اس کی زبان بن جاتی ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور باتیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابات آپؐ کی چشم و ابرو کے ایک ادنیٰ اشارہ کے منتظر رہتے ہیں اور تقدیروں کا بدل جانا آپؐ کی معمولی توجّہ کا کرشمہ ہوتا ہے۔! ؎

«عبدہ» صورت گر تقدیر ہا　　اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
کس ز سرِّ «عبدہٗ» آگاہ نیست　　«عبدہٗ» جز سرِّ الّا اللہ نیست

لیکن اس عشق و مستی کے باوجود ملّت کا درد اقبالؒ کے دل میں موجود رہتا ہے اور جس بے تابی سے وہ اپنی محبّت اور وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں اسی بے تابی سے وہ قوم کی حالت زار کو بھی حضور رسالت پناہ میں پیش کر کے اس کی اصلاح کی درخواست کرتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کا سینہ سوز سے خالی ہو گیا۔ اس کا دل روتا تو ہے لیکن وہ اس آہ و زاری کے سبب سے ناواقف اور اپنے مقصدِ حیات سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ اس لیے یارسول اللہ! آپؐ کی ایک نگاہ کی ضرورت ہے! ؎

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے!　　رمیدہ از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد! چرا نالد! نداند　　نگاہے یارسول اللہ نگاہے

مسلمانوں کا کارواں اپنی منزل سے دور ہو گیا ہے۔ ان کا نظامِ حیات بگڑ چکا ہے۔ ان کے خون میں حرارت باقی نہیں ہے، ضمیر اثر آفرینی سے محروم ہو گیا ہے، اقتصادی حالت تباہ ہے، عسکریت کا جوہر زائل ہو چکا ہے اور قرآن کو جس کے فیض سے وہ ایک عالم کی بادشاہی کرتے رہے ہیں انہوں نے طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے۔ ؎

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش　　نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیام او تہی چوں کیسۂ او!　　بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

مسلمان دل کی دنیا سے ناآشنا ہے۔ خودی کا جوہر اس میں مفقود ہو گیا ہے۔ بانگِ تکبیر کی برکتوں سے اس کا ضمیر خالی ہے اور اس کا نصب العین اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اِس لیے اے آقائے مدینہ! اس کے جوہر کو پاکی عطا کیجیے، اس کے دل میں ایک دنیا آباد کیجیے اور اس کے چراغِ زندگی کی حفاظت فرمائیے جو اس کے دامنِ چاک چاک میں زمانہ کی تیز آندھیوں کے سبب سے بھڑک رہا ہے۔

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او　　جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک　　بلندیش از چراغِ بسملِ او

اس کی زندگی غیر کی فکر کے تابع ہے۔ وہ موت سے خائف اور اسرارِ مرگ سے ناواقف ہے۔ اس کا شیخ علم الاساطیر (Mythology) کو اپنی متاع سمجھتا ہے۔ وہ تخمین و ظن میں الجھا ہوا ہے اور اسلام کو کفر کی طرف اور حرم کو دیر کی طرف لیجا رہا ہے۔

؎ متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود　　حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلام او زنّار دار است　　حرم چوں دیر بود او برہمن بود

مسلمان جب تک آپؐ کی تعلیم کے پابند رہے، شہنشاہی کے گریبان چاک کرتے رہے لیکن ایمان کی آگ جب سینے میں سرد پڑ گئی تو وہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے لگے مجھے یارسول اللہ، شکایت خود اپنوں سے ہے کہ وہ آپؐ کے شایانِ شان نہیں رہے ؎

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم!　　چو گبراں در حضورِ او سرودیم
نہ ما از کسے، می نالم از خویش　　کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

خانقاہیں ذوق و شوق سے خالی ہو گئی ہیں۔ مدرسوں میں اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے شاعری بے جان اور نغمہ بے کیف ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کا ایمان مردہ اور اس کی بصیرت زائل ہو گئی ہے۔ بے یقینی کا وہ شکار ہے اور تمام اسباب خیر سے ناامید ہو گیا ہے ملّا منبر پر لچھے دار گفتگو کرتا ہے اور ہر بات کی سند کتابوں سے پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کو ملّت کا کوئی درد نہیں ہے، اس کی آنکھ میں نمی باقی نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے۔ یارسول اللہ! مسلمانوں کی ایسی حالتِ زار پر ایک رات خدا کے سامنے میں پھوٹ پھوٹ کر رویا اور پوچھتا رہا کہ مسلمان ہر جگہ کیوں ذلیل و خوار ہیں۔ حضورِ حق سے مجھے جواب ملا کہ اس ذلّت و خواری کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنا نصب العین کھو چکے ہیں، وہ اپنے سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس دل کے لیے کوئی معشوق نہیں رکھتے۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار　　مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمیدانی کہ ایں قوم　　دلے دارند و محبوبے ندارند

مسلمانوں کو دنیا کا ہر غم گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ وہ دنیا کی ہر طاقت سے خوف کرتے ہیں اور موت کو بلائے ناگہانی سمجھتے ہیں۔ میں اپنے نغموں کے سوز میں جلتا رہا

ہوں اور آپ کی بخشی ہوئی قوتِ پروار کی بدولت تمام عالم میں اڑتا پھرا ہوں لیکن مجھے ایک بھی مسلمان ایسا نہیں مل سکا جس کی ہیبت سے موت لرزہ براندام ہوتی ہو۔

باں بالے کہ بخشیدی پریدم — بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد — جہاں گردیدم و او را ندیدم

مگر اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان کو اس کا مقام دکھایا جائے، اس کے جوہر سے زنگ کو دور کر دیا جائے۔ اسے رموزِ کائنات سے واقف اور اسرارِ مرگ و حیات سے روشناس کرایا جائے۔ اس لیے اے سیّد الثقلینؐ! اس فقیر کے سوز سے مسلمان کو آتشیں ضمیر فراہم کیجئے اور اس کے دل کو ایمان و ایقان کی طاقت اور امید کی روشنی عطا کیجئے جس سے اس کے قلب و نظر کو استحکام نصیب ہو سکے۔

؎ زسوزِ ایں فقیرے رہ نشینے — بدہ او را ضمیرِ آتشینے!!
دلش را روشن و پابندہ گرداں — زامیدے کہ زایدازیقینے

مسلمان کو میں نے اس کی خودی سے روشناس کر دیا ہے۔ اب اس کے دل سے دنیوی خوف اور غم کو نکال دینے کی ضرورت ہے، اس لیے اے سراجؐ السالکین! میرے نالوں کو ایسی تپش بخشئے کہ جس کے ذریعے میں بجز غمِ دیں کے ہر غم کو جلا کر راکھ کر سکوں۔

؎ خودی دادم زخود نامحرمے را — کشادم در گلِ او رزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ ازوے — بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را

ملّتِ اسلامیہ جوانانِ پاک باز سے خالی اور سرودِ عشق و مستی سے محروم ہو گئی ہے وہ کمزور، معذور اور غیر کی نگاہِ کرم کی محتاج ہو گئی ہے۔ اور یہی صورتِ حال اس کے زوال و پستی کا باعث ہے۔ اس لیے امام القبلتینؓ! اس ملت کو جوانانِ پاکباز عطا کیجئے اور اپنی خانہ ساز شراب کے سرور سے انہیں سرفراز کر کے دلِ بے نیاز اور بازوئے حیدرؓ انہیں بخش دیجئے۔

بدہ او را جوانانِ پاکبازے! — سرورش از شرابِ خانہ سازے
قوی بازوئے او مانندِ حیدرؓ — دل او اندو دگیتی بے نیازے

GIFT

اقبالؒ قوم کی حالتِ زار اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ اقبال کی اس گفتگو سے ساقیٔ کوثر کا دل بھر آتا ہے۔ ان کی محبّت کا اعتراف کیا جاتا ہے، انہیں مقامِ بلند سے سرفراز فرمایا جاتا ہے اور اپنی تمنائے دلی کے اظہار کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس پر اقبالؒ بکمال ادب عرض کرتے ہیں کہ اے راحت العاشقینؐ! اے رحمۃ للعلمینؐ! مجھ گنہگار کو اپنی آرزو کے اظہار سے شرم آتی ہے لیکن چونکہ آپؐ کی شفقت اور رحمت سے میری ہمّت افزائی ہو رہی ہے اس لیے عرض کرتا ہوں کہ میری ایک ہی دلی آرزو ہے۔ یہی آرزو مجھے بے چین کئے ہوئے ہے، یہی میرے درد و کرب کا باعث ہے اور اسی کے شعلوں میں جل رہا ہوں مجھے اس ارضِ پاک سے اُنس ہے، عرب کے اِس صحرا سے اُلفت ہے، اس ریگزار کا ایک ایک چپہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کے ایک ایک ذرّہ میں میرا جُملہ عشق و محبت آراستہ ہے۔! اس لیے میری تمنائے دلی ہے کہ میں یہیں مروں یہیں دفن ہوں اور میرے مرقد کی تعمیر آپؐ ہی کی دیوار کے سایہ میں ہو تاکہ میرے بیتاب دل کو سکون اور میری روح کو اطمینان نصیب ہو سکے اور میں فلکِ پیر سے کہہ سکوں کہ میرے آرام و آسائش کو دیکھا، میرا آغاز تو تو نے دیکھا تھا، اب میرے انجام کو بھی دیکھ۔!

شرم از اظہار او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزائد مرا
ہست شانِ رحمت کیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
"مسکنِ یار است شہر شاہِ من — پیشِ عاشق ایں بود حبّ الوطن"
کوکبم را دیدہ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاسا ید دلِ بیتابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر — دیدۂ آغاز و انجامم نگر

سید واجد علی رضوی

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY
Acc No 1953
ALLOWED

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر